صرٌ من اللہ وفتحٌ قریب

ھفت روزہ

نصرت

لاھور

۳۰

اتوار، ۲۰ اِپریل ۱۹۶۹ء

فوٹو: مجید میر

مدیر: محمد حنیف رامے

۳۰ پیسے

پڑھنے والے لکھتے ہیں

انجمن

تنقید کا شکریہ

میں اس بات کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ہمارے چیمبر (چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری) کے خیالات کو (تنقید کے لائق سمجھ کر) نصرت کے چھ اپریل ۱۹۶۹ء کے شمارے میں اہمیت دی۔ چیمبر کے ایک سربراہ کے طور پر مجھے بہرحال معاشی نقصانات کا جائزہ لینا ہے۔ البتہ آپ نے اس سے جو نکتہ اخذ کیا ہے وہ بلاشبہ حب الوطنی پر مبنی ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں بھی اتنا ہی محب وطن ہوں۔ گو ایک پاکستانی کی حیثیت سے یہ میرا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے اور جہاں تک اس چیمبر کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ تنظیم بھی ایسے اشخاص پر مشتمل ہے جو اتنے ہی قوم پرست ہیں اور جس سرزمین میں بستے ہیں اس سے محبت رکھتے ہیں۔

بہرحال آپ نے اداتی کالموں (حالات حاضرہ) میں جو تبصرہ کیا ہے اس سے متاثر ہو کر میں آپ کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

یوسف۔ ایچ شیرازی، صدر چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری، کراچی

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

مال روڈ سے گزرتے ہوئے ایک سُرخ بورڈ پر نظر پڑی۔ خیال آیا کہ ایک اور سوشلسٹ پارٹی کا اضافہ ہُوا ہے۔ قریب جا کر جب بورڈ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جسٹس پارٹی کا بورڈ ہے جس کی زمین کا رنگ بالکل وہی ہے جو بھٹو صاحب کی کتاب پاکستان کی سیاسی حالت کا ہے۔ یہی نہیں اس پارٹی نے اپنے لیے اصولی زمین بھی وہی رکھی ہے جو بھٹو صاحب کی تیار کردہ ہے۔ اس کا منشور تقریباً وہی ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی کا ہے۔ اس کا نعرہ سماجی و اقتصادی انصاف۔ بھی اسلامی سوشلزم کا ترجمہ ہے۔ اس پارٹی کے سربراہ نے بھٹو صاحب کی پیدا کردہ سیاسی فضا میں انہی کے الفاظ اپنا کر فائدہ اٹھایا۔ لوگ سمجھتے رہے بنیادی طور پر شاید دونوں کے نظریات ایک ہیں۔ پارٹی کا اعلان کرنے کے بعد پارٹی کے اغراض اور مقاصد بھی تقریباً وہی رکھے ـــ تو پھر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کیوں ؟ جب کہ ایر مارشل صاحب یہ کہہ کر چلے تھے کہ وہ سیاسی جماعتوں میں اتحاد پیدا کر کے

ان کی تعداد کم کریں گے ؟

شیخ ضیاءالدین سرکلر روڈ ـــ لاہور

ترقی کی ٹھوس بنیادیں

نصرت (۲۹) میں کارنیلیس رپورٹ کا خلاصہ پڑھا۔ پچھلے تمام عرصے میں اس رپورٹ کو حکومت نے عوام سے پوشیدہ رکھا۔ اس کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے، کس قدر ستم ظریفی ہے کہ جب بھی ملک و قوم کی ترقی کے لیے بہتر تجاویز پیش کی گئیں ان کو محض اس لیے رد کر دیا گیا کہ مخصوص مفادات سے ان کا ٹکراؤ ہوتا تھا۔ رپورٹ میں ماہرینِ فن کو وہی مقام دیا گیا ہے جس کا مطالبہ وہ پچھلے چھ ماہ کے دوران کرتے رہے اور جس کے وہ حقیقی معنوں میں حق دار ہیں۔ جب عوامی جدّوجہد کے دوران چیف انجنیئر کے درجے کے لوگ بھی جلوس نکال رہے تھے تو وہ تنخواہوں میں اضافے کے مقابلے میں اس رپورٹ پر عمل درآمد کا مطالبہ کر رہے تھے۔ امید ہے کہ مارشل لا ر حکومت اس جانب خصوصی توجہ دے گی تاکہ ملک میں ٹھوس اقتصادی ترقی کی بنیادیں رکھی جا سکیں۔

الطاف حسین رضوی، بندر روڈ کراچی

پُرانی قیادت سے تازہ خطرہ

آج سے چھ ماہ پیشتر ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی تحریک کا آغاز کیا تھا اور اس تحریک کو قابو میں رکھنے کے لیے انہوں نے انتخابات کے ذریعے کو اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ طلباً، وکلاء، اساتذہ، صحافی، ڈاکٹر، مزدور اور کسان ایک آواز بن کر اٹھے تھے۔ پوری قوم جاگ اٹھی تو پرانے سیاسی لیڈر جو اب تک خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے ان میں آ شامل ہوئے اور قوم کو یہ یقین دلانے لگے کہ جب تک ہمارے تمام مطالبات نہیں مان لیے جاتے، ہم انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ عوام ان کے ماضی کو جانتے ہوئے بھی سوچنے لگے کہ شاید دس سال کے عرصے نے انہیں ہمارا ہمدرد بنا دیا ہو ـــ لیکن جب گول میز کانفرنس ہوئی اور یہ لوگ عوامی مطالبات کو منوانے کا لیبل لگا کر اس میں شریک ہوئے تو یہ بات ہر شخص پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ ان کو خون میں غلطاں و پیچاں طلباً، زبُوں حال وکلاء، ڈاکٹر اور اساتذہ ننگے بھوکے مزدور اور کسان اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے صحافیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی بلکہ تمام جدّوجہد کرسیاں حاصل کرنے کے لیے تھی۔

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے یقین دلایا ہے کہ پر امن فضا قائم ہو جانے کے بعد سیاسی پارٹیوں کو مکمل آزادی دے دی جائے گی تاکہ آزادانہ انتخابات ہو سکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ آزادی مِل جانے کے بعد ان سیاسی رہنماؤں کا عوامی ہمدردی کے نام پر کون سا رُوپ ہو گا۔

شاہدہ پروین، پیپلز کالونی۔ لائلپور

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؒ اور سوشلزم

۲۱، اپریل ۱۹۳۸ء کو جب علامہ اقبال فوت ہوئے تو پنجاب میں قائداعظم محمد علی جناح کے دستِ راست ملک برکت علی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا تھا :

” ـــــ اقبال فوت ہو گئے وہ فنا فی الاسلام اور سچے سوشلسٹ تھے ــ “

اقبال کو ”سوشلسٹ“ کا خطاب اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ کسی سوشلسٹ پارٹی کے بانی یا قائد تھے ۔ ان کی سوشلزم کی بنیاد یہ تھی کہ وہ اسلام کے اقتصادی نظام کو سوشلزم کے قریب پاتے تھے ۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے ہم وطنوں، خصوصاً مسلمانوں کی غریبی پر رونا آتا تھا کہ اسلام کی اجتماعیت میں اس کا شافی علاج ہوتے ہوئے بھی لوگ بھوکوں مر رہے ہیں ۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ہماری سرحدوں کے قریب ہی سوشلزم کا جو تجربہ ہو رہا تھا اس سے غریبی اور مفلسی کا خاطر خواہ علاج ہو سکتا تھا اور یہ علاج اپنی بنیاد میں اسلام کی روح سے ہم آہنگ تھا ۔

” اسلامی دنیا کے آس پاس اشتراکیت کی صورت میں جو نیا اقتصادی تجربہ کیا جا رہا ہے اس سے اسلام کے مقصد اور اس کی اصل روح کے بارے میں ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں ۔“ (لیکچرز)

اقبال نے سوشلزم کے تجربے کو غریبی اور مفلسی کے علاج کے طور پر دیکھا تھا ۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ سوشلزم کو صرف تقسیمِ دولت کا نظریہ نہیں بلکہ پیدائشِ دولت کا نظریہ سمجھتے تھے ۔ غریبی اور مفلسی کا علاج اس وقت تک ناممکن ہے جب تک پیداوار میں اضافہ نہ ہو ۔ سوشلزم غریبی کو تقسیم کرنے کا نام نہیں بلکہ رزق کی اس فراوانی کو وجود بخشنے کا نام ہے جس میں سب کی ضروریات کی کفالت ہو ۔ اقبال کے فکر میں یہ نکتہ شروع ہی سے واضح ہے کہ انسان کو بنیادی ضروریات کا تحفظ نصیب ہونا چاہیئے ۔ جب اقبال پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے رکن تھے تو انہوں نے اسی جذبے کے تحت یہ انقلابی تحریک پیش کی تھی کہ جس طرح شہروں میں ایک خاص آمدنی تک ٹیکس کی چھوٹ دی جاتی ہے اسی طرح کم آمدنی والے کسانوں سے بھی مالیہ وصول نہ کیا جائے تاکہ غریب کسان بھی ایک گونہ سکھ کا سانس لے سکیں ۔

بہت کم احباب یہ جانتے ہیں کہ اقبال کی سب سے پہلی تصنیف ــ علم الاقتصاد ــ کا یہی موضوع تھا کہ غریبی کیونکر ختم ہو سکتی ہے ۔ اس میں اقبال نے کہا تھا :

” غریبی قوٰی انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو دہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے ۔“ (دیباچہ ــ نیا ایڈیشن، ص ۲۳-۲۴)

یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی جب اقبال کے شاعرانہ اور فلسفیانہ کردار کی ابتدا تھی ۔ ایک عمر کے غور و فکر کے بعد ۲۸ر مئی ۱۹۳۷ء کو اقبالؒ نے جناحؒ کے نام ایک خط میں وضاحت کی :

” شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے ۔“

ان چند سطروں سے عیاں ہے کہ نظریۂ پاکستان کا خالق اپنی ذہنی بلوغت سے موت کے لمحوں تک اس آرزو میں گھلتا رہا کہ جس اقتصادی پسماندگی نے اس کی قوم کو نڈھال کر کے رکھ دیا ہے وہ کسی طرح دور ہو ۔ اس مسئلے کا سیاسی حل تو قیامِ پاکستان کی شکل میں سب کے سامنے ہے، اس کا معاشرتی حل البتہ ٹھوس بنیادیں طے نہ ہونے کے باعث لفظی گورکھ دھندوں میں الجھا چلا آتا ہے ۔ اسلامی قانون ہمارے سیاستدانوں کے لیے تو بھاری پتھر ہے ہی، ہمارے بڑے بڑے قانون دان بھی اسے چوم کر چھوڑ دیتے ہیں ۔ مگر اقبال نے اس پتھر کی نشان دہی کرنے پر اکتفا نہ کی تھی، اس نے ’معقول‘ کے اہم لفظ کے ذریعے اس بند خزانے کی چابی مہیا کرنے کا راستہ

بھی دکھایا تھا۔ اقبال کا ہر سنجیدہ قاری اس حقیقت سے واقف ہے کہ قرآن حکیم اس کے یہاں ہر اصول کی اصل ہے۔ اللہ نے محکم فیصلہ کر دیا ہے کہ قانون بس خدا ہی کا ہے۔ (الانعام: ۵۷) وہی ہر معاملے کا آخری فیصل ہے۔ (آل عمران: ۱۰۵) جب یہ صورت ہو تو قرآن عزیز ہی دوسرے معاملے کی طرح اقتصادی میدان میں بھی میزان اور سرچشمۂ ہدایت ٹھہرتا ہے۔ صرف اسے حرفِ آخر سمجھنا چاہیئے اور ہر معقول بات خواہ وہ امام ابوحنیفہ کی ہو یا کارل مارکس کی، اگر قرآن کی کسوٹی پر صحیح ثابت ہو سکتی ہے تو اسے قبول کرنے میں عار نہ ہونی چاہیئے۔

جن لوگوں نے اقتصادیات کو انسانی زندگی میں خاص اہمیت دینے پر زور دیا ہے ان میں کارل مارکس پیش پیش ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی کا تو امام ہی مارکس ہے۔ اقبال بھی مارکس کے افکار سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے بارے میں اشعار کہنے کے علاوہ اقبال نے ۱۹۲۱ء میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو ایک خط میں لکھا تھا:

”اگر مارکسزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر لیا جائے تو وہ اسلام کے بہت ہی قریب آجاتی ہے۔“

حال ہی میں مغربی دُنیا کے مفکّروں نے مختلف وجوہ کی بنا پر مارکس کے نظریات کی جو چھان پھٹک کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے فکر میں ایسے مقامات موجود ہیں جہاں وہ انسان کو پورے انسان کی حیثیت دیتا ہے اور زندگی کو پوری زندگی سمجھتا ہے۔ اس ضمن میں مارکس کے رفیق اینگلز کی ایک وضاحت کافی ہوگی:

”تاریخ کے مادّی نظریے کے مطابق تاریخ کا فیصلہ کن اصول یہ ہے کہ انجام کار حقیقی زندگی کی پیدائش اور پیدائشِ نو ہو سکے۔ اس سے زائد نہ مارکس نے نہ میں نے کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اس لیے اگر کوئی اس اصول کو اس بیان میں بدل کر رکھ دے کہ بس اقتصادی پہلو ہی فیصلہ کن ہوتا ہے تو وہ اسے ایک بے معنی، بے بنیاد اور لغو جملے میں ڈھالنے کا مرتکب ہوگا۔ اقتصادی صورت حال بے شک بنیادی اہمیت رکھتی ہے لیکن اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہے اس کے گوناگوں عناصر — طبقاتی کشمکش کی سیاسی صورتیں اور اس کے نتائج مثلاً کامیاب جدوجہد کے بعد فتح یاب طبقے کا قائم کردہ دستور وغیرہ، عدالتی اسالیب اور پھر اس ساری حقیقی جدوجہد کا ان لوگوں کے ذہنوں پر اثر جو اس میں حصّہ لیتے ہیں — یہ سب بھی اہم ہیں۔ گویا سیاسی، عدالتی، فلسفیانہ نظریات، دینی عقائد اور ان سے پھوٹنے والے محاکماتی نظام بھی تاریخی کشمکش میں اپنا اپنا اثر پھونکتے رہتے ہیں اور اکثر حالتوں میں اس کی تشکیل میں دوسرے عناصر سے بھی زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

”خود مارکس اور میں یہ صورت حال ابھارنے کے کچھ کچھ مجرم ہیں کہ نئے ادیب اقتصادی پہلو پر اکثر ناواجب حد تک زیادہ زور دیتے ہیں۔ ہمیں تو اپنے مخالفوں کے خلاف اقتصادی اصول پر اس لیے اصرار کرنا پڑا تھا کہ وہ اس کی اہمیت کے منکر تھے۔ پھر مارکس کو اور مجھے کبھی اتنا وقت اور موقع ہی نصیب نہیں ہوا کہ انسانی زندگی میں جو دوسرے عناصر کارفرما ہیں انہیں ان کا جائز مقام دلاتے۔ یوں بھی جب تاریخ کے کسی ایک قطعے (اقتصادی تاریخ) پر بحث ہو رہی ہو تو توجہ اسی پر مرکوز رہتی ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اسے بے عیب طور سے پیش کر دیا جائے۔ مگر بدقسمتی سے اکثر ہوتا یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اُنہوں نے کسی نئے نظریے کا احاطہ کر لیا ہے اور اب وہ اسے بلا تردد عملی جامہ پہنا سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس کے بنیادی (اقتصادی اصولوں کو ذہن نشین کر لیا ہے۔ حالانکہ ہوتا یہ ہے کہ انہوں نے ان اقتصادی اصولوں کو بھی ٹھیک طرح سے سمجھا نہیں ہوتا۔ اور میں آج کل کے بہت سے جدید مارکسیوں کو بھی اس الزام سے بری قرار نہیں دے سکتا کیونکہ ان لوگوں نے بھی اس سلسلے میں نہایت حیرت انگیز بکواس پیش کی ہے۔“ (سیلیکٹڈ ورکس آف کارل مارکس، ماسکو صفحہ ۳۲۱)

اقبال کے ساتھ مارکس کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ ان دونوں کو بالعموم دو انتہاؤں کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اقبال کو شاعر کے بعد کچھ سمجھا جاتا ہے تو فلسفی، اور مارکس کو رُوکھے پھیکے دہریے کے بعد کچھ سمجھا جاتا ہے تو اس رُوسی کمیونزم کا جدِ امجد جس میں افراد بڑی حد تک معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور زندگی کا مقصد یہ قرار پایا ہے کہ اقتصادی ترقی کی جائے۔ لیکن اقبال کے بارے میں اگر ہم یہ یاد کریں کہ اسے قوم کی اقتصادی ترقی سے بھی کتنی گہری دلچسپی تھی تو اُمید ہے اس سلسلے میں ہمارا ذہنی تعطل ٹوٹنے میں مدد ملے گی اور ہمیں یہ احساس ہوگا کہ زندگی کا اقتصادی شعبہ ہماری سنجیدہ اور اجتماعی کوشش کا طالب ہے؛ اور اقتصادی شعبے میں اجتماعی کوشش کا نام سوشلزم ہے جس کی تعلیم مارکس نے دی تھی۔ بے شک انفرادی سطح پر ہم شاید ضرورت سے بھی بڑھ کر اقتصادی مفادات کی تلاش میں جُتے ہوئے ہیں لیکن جس طرح سیاسی آزادی کے لیے ہم نے کبھی مل جُل کر جدوجہد کی تھی جب تک اقتصادی پسماندگی سے نجات کے لیے بھی اسی طرح کی اجتماعی جدوجہد نہیں کریں گے صورتِ حال بدلنے کے امکانات پوری طرح روشن نہیں ہوں گے۔

اگر بعض لوگوں کو ترک قرآن کا ایسا ہی جنون ہے تو وہ اقبال ہی کے حوالے سے یہ جان لیں کہ اقتصادی پسماندگی بھی خدا کا عذاب ہوتی ہے اور اس کے خلاف بھی ملت کو مجموعی طور سے سرگرم عمل ہونا چاہیئے۔ کیا اس عذاب کو محض اس لیے مسلّط رکھا جائے گا کہ اس سے نجات کے راستے کا نیا نام سوشلزم ہے۔

اقتصادی خوشحالی کی اجتماعی کوششوں کو مارکس کی تعلیم نے عام کیا ہے۔ اجتماعی یا سوشلسٹ یا کمیونسٹ نظام بظاہر زندگی کے اقتصادی پہلو کو اوّلین اہمیت دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک مارکس یا اینگلز کی اپنی تحریروں کا تعلق ہے یہ حقیقت اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ اجتماعی یا منصوب معیشتوں کا منتہیٰ بھی حقیقی اور وسیع تر زندگی ہو سکتا ہے۔

اس بحث سے ہماری اقتصادی زندگی کا جو منظر ہمارے سامنے کھلتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی اور دینی زاویے سے

بھی اقتصادی شعبے میں ترقی کرنا ضروری ہے اور اقتصادی ترقی کے لیے اگر اجتماعی انداز سے کوشش کی جائے تو اس کا لازمی نتیجہ انفرادی غلامی یا زندگی کی کوتاہی نہیں ہوتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال اپنے دور کا سب سے بڑے مسلمان نظر آتے ہیں اور سب سے بڑے سوشلسٹ بھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبالؒ نے قائداعظمؒ کو قیامِ پاکستان کی ترغیب دیتے ہوئے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو بسترِ مرگ سے لکھا تھا:

”اسلام کے لیے اشتراکی جمہوریت (سوشلزم) کو کسی موزوں شکل میں قبول کرنا حقیقت میں اسلام سے انحراف نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹنے کے مترادف ہے۔“

اور یہی وہ مقام تھا جس نے ۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ میں قائداعظم محمد علی جناح کے مُنہ سے یہ الفاظ کہلوائے تھے:

”جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیادیں سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم پر ہیں تو نہ صرف میرے بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔“

ہماری دانست میں قائداعظم کے ان الفاظ کو دُہرا کر ہم یومِ اقبال پر اقبال کو عظیم ترین خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ جب صاحبِ علم اقبال کے فکر کو مردِ میدان جناح نے اپنا لیا تو اس سے بڑھ کر اقبال کو کوئی کیا خراجِ عقیدت پیش کرے گا۔ البتہ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اقبال کے فکر کی معراج اور قائداعظم اور کروڑوں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمان — اسلامی سوشلزم — کو کیونکر اور کب پاکستان میں نافذ کرتے ہیں۔

محمد حنیف رامے

عالمی جائزہ

صدر نکسن کا استقبال

گندے انڈے اور ٹماٹر

نسیم احمد باجوا۔ انگلستان

وسط فروری سے لے کر وسط مارچ تک یورپ میں اتنے اہم واقعات رونما ہوئے کہ ان ۳۰ دنوں کو عصری تاریخ میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ صدر نکسن جہاں جہاں بھی گئے، غضبناک مظاہرین نے ویت نام میں امریکہ کی جارحیت، یورپی معیشت پر امریکی سرمایہ کی بڑھتی ہوئی اجارہ داری اور بذاتِ خود ان کی آمد کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ لندن کے ہوائی اڈے پر حفاظتی انتظامات کی سختی کا یہ عالم تھا کہ نکسن کے خصوصی طیارے کو ہیتھرو ایرپورٹ کے ایک اجاڑ اور بیابان حصے میں اتروایا گیا۔ گنتی کے سرکاری مہمانوں، اخباری رپورٹروں کی فوج ظفر موج (جن میں اکثریت امریکیوں کی تھی) اور پولیس کی بھاری جمعیت کے علاوہ کسی شریف آدمی نے اتنی دور جا کر ”معزز“ مہمان کا استقبال کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ وزیرِ اعظم ولسن نے اپنی تقریر میں ”باس“ کی اتنی خوشامد کی کہ ٹیلی ویژن دیکھنے والے انگریزوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ رہی سہی کسر ولسن کے بے حد مودبانہ انداز اور فدویانہ لہجے نے پوری کر دی۔ صدر نکسن کی روانگی پر بی بی سی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دو دن پہلے لندن میں جو سرکس والے آئے تھے وہ اپنا تماشا دکھا کر آج جا چکے ہیں۔

پروفیسر ہیرلڈ لاسکی نے اپنی کتابوں میں برطانوی عدلیہ کی غیر جانبداری کا پول اچھی طرح کھولا تھا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ عدلیہ بھی ہر مخصوص معاشی اور سیاسی نظام کے کل پُرزے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل جج صاحبان جس نظام کی پیداوار ہوں، وہ اُس کی تمام اقدار کے محافظ ہوتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس رجعت پسند کردار کو عدل کا نام دیا جاتا ہے؟ اب مجھے لاسکی اور ان کی سچی باتیں اس لیے یاد آئیں کہ لندن میں نکسن کے خلاف مظاہرہ کرنے والے نوجوانوں کو بڑی سخت سزائیں دی گئی ہیں۔ ایک ۲۶ سالہ کمپیوٹر انجینئر کو چھ ماہ قید کا حکم سناتے ہوئے مجسٹریٹ نے اپنے فیصلے میں امریکہ کی شان میں قصیدہ بھی پڑھا۔ ایک اور نوجوان کو اس سنگین جرم کی پاداش میں دو ماہ قید کی سزا دی گئی کہ اس نے کمال ہوشیاری سے مظاہرین کا تعاقب کرنے والے ایک پولیس کانسٹیبل کے آگے اس طرح اپنی ٹانگ بڑھا دی کہ ملکۂ معظمہ کا ایک مستعد ملازم دوڑتا ہوا گر پڑا (یقیناً بے چارہ بری طرح گرا ہوگا اور اس حادثہ سے بہت تماشائی محظوظ ہوئے ہوں گے) بہرحال جونہی سزائیں سنائی گئیں، چاروں خطرناک مجرموں نے اس صریحاً بے انصافی کے خلاف عدالت ہی میں تقریر کرنی شروع کر دی۔ مقدمے کی کاروائی سننے والے لوگوں

نے پُرجوش تالیاں بجا کر اپنی ہمدردیاں ظاہر کیں تو انہیں عدالت سے باہر نکال دیا گیا اور پھر پولیس کی مداخلت نے ان باہمت اور باضمیر نوجوانوں کی تقریروں کا سلسلہ بہت جلد منقطع کر دیا۔ اب پیرس کا حال سنیئے۔ وہاں نکسن کی آمد پر لندن سے بھی زیادہ شدید مظاہرے ہوئے۔ بائیں بازو کے طلباء کے ایک طوفانی گروپ نے پان امریکن ایئرویز، امریکن ایکسپریس، کنٹاس (آسٹریلوی) ایرلائن، پرتگال کے محکمۂ تجارت۔ اور یونان کی اولمپک ایئرلائن (جس کا مالک سابق مسز کینیڈی کا خاوند اوناسس ہے) کے دفاتر اور ہوٹل ہلٹن پر حملہ کر کے ان کی کھڑکیوں، فرنیچر اور دوسری کارگہِ شیشہ گری کو پاش پاش کر دیا۔ نکسن کے خلاف مظاہرے کرنے کی اپیل سرکاری طور پر نیشنل سٹوڈنٹس یونین نے کی تھی۔ فرانس بھر میں اس خبر سے غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی کہ دیوار پر "نکسن مردہ باد" کا نعرہ لکھنے والے ایک طالب علم کو کار پر سوار پولیس نے گولی مار کر زخمی کر دیا۔ روم میں نکسن کے خلاف مظاہروں نے پیرس کو بھی مات کر دیا۔ طلباء نے ایک امریکی اخبار کے دفتر کو جلا کر راکھ کر دیا (بشمول چھاپہ خانہ)۔ ایک متغیریافتہ سپاہی نکسن کی کار کے آگے لیٹ گیا۔ ہنگاموں کے درمیان ایک نوجوان ایک بلند عمارت سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ ۳۰ مظاہرین زخمی ہوئے اور ۵۰۰ گرفتار۔ مغربی جرمنی میں نکسن کے جلوس پر بائیں بازو کے طلباء نے گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے بوچھاڑ کر دی۔ لندن، پیرس اور روم کی طرح برلن میں بھی جابجا ویت کانگ حریت پسندوں کے سُرخ پرچم نظر آتے تھے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود تمام میزبان ممالک کی پولیس بڑی خوش ہے کہ ٹیلی فون پر موصول ہونے والی دھمکیوں کے مطابق نکسن یا اُن کے عملہ پر کوئی بم نہیں پھینکا گیا۔

یہ بات کتنی دلچسپ ہے کہ برطانیہ میں سوائے چڑیا گھر کے اور کہیں شیر تو کجا اس سے ملتی جلتی کسی اور چیز کا نام نشان تک نہیں ملتا مگر اس ملک کی حکومت کے سرکاری نشان میں گھوڑے اور شیر کو تاج تھامے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ جو لوگ سرکاری نشان میں شیر کی موجودگی پر شیر ہیں۔ وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ شیر بہت بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہے۔ یہ سطور لکھتے وقت خبر آئی کہ برطانوی حکومت جزائر غرب الہند کے ایک چھوٹے سے حصّے ۔۔۔ انگیلا پہ فوج کشی کی تیاری کر رہی ہے۔ پارلیمنٹ میں بائیں بازو کے ارکان نے اسے بوڑھے شیر کا مسخرہ پن اور تکلیف دہ مذاق قرار دیا ہے۔ انگیلا کی بحری ناکہ بندی یا اس خوبصورت جزیرہ پر چھاتہ بردار فوج کا اتارنا محض یہ ثابت کرنا ہے کہ "ابھی تو میں جوان ہوں"۔ برطانیہ جو مسئلہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کے درمیان صلح کرانے کی درپردہ کوشش کرتا رہتا ہے سلامتی کونسل کے مستقل ارکان میں شامل ہے۔ اور دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کا ٹھیکیدار بنا پھرتا ہے مگر درحقیقت یہ سامراجی طاقت نوآبادیاتی نظام کے تحفظ کی خاطر بے شمار امن دشمن حرکات کرتی ہے۔ یہ امریکہ کی بہترین حلیف ہے اور ویتنام میں امریکی جارحیت کی پوری امداد کر رہی ہے۔ برطانیہ کے سرمایہ دار طبقے میں (امریکہ کی طرح) صیہونیت کے حامی یہودی کروڑپتیوں کا عنصر اتنا غالب ہے کہ اس کے معاشی دباؤ اور سیاسی اثر و رسوخ کو یہاں کی کوئی حکومت نظرانداز نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے بعد اسرائیل کا دوسرا بڑا سرپرست برطانیہ ہے۔ ہر سال برطانیہ کے یہودی سرمایہ دار اسرائیل کو کروڑوں پاؤنڈ چندہ عطیہ دیتے ہیں۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں برطانوی حکومت کی چشم پوشی سے فائدہ اٹھا کر سینکڑوں تربیت یافتہ انگریز (سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے چھٹی لے کر) ایک دن کے اندر رضاکار بن کر اسرائیل جا پہنچے۔ ان دنوں پارلیمنٹ میں بائیں بازو کے ارکان (جو عرب دوست اور اسرائیل دشمن ہیں) عربوں کی حمایت کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی انجمن بنا رہے ہیں۔ انہوں نے سابقہ وزیر خارجہ جارج براؤن کو اس کا عہدہ دار بننے کی پیشکش کی مگر اسرائیلی لالی کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ براؤن خواہش کے باوجود اس میں شامل نہیں ہو سکا۔ جو لوگ ہمارے ملک میں کسی نہ کسی شکل میں (یا اسلامی لبادہ اوڑھ کر) سرمایہ داری کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اب تو بین الاقوامی طور پر سرمایہ داری کا سفینہ ڈوب رہا ہے۔ جنگِ ویت نام کی وجہ سے ڈالر کو سالانہ دل کے دورے پڑتے ہیں۔ پاؤنڈ بے چارہ تو ایک عرصہ سے دائم المریض ہے۔ فرانک کے دکھوں کا آگے چل کر ذکر ہو گا۔ مغربی سرمایہ داری پورے دو سو سال ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام اور وسائل کا استحصال کر کے اپنے نقطۂ عروج تک پہنچی۔ اب جدید نوآبادیاتی نظام اس کا روحِ رواں ہے۔ مگر جوں جوں تیسری دنیا میں عوامی انقلاب کی آگ اس نظام کی روپہلی زنجیروں اور سامراجیوں کی آکاس بیل کے حلقوں کو جلا کر راکھ کرتی جاتی ہے۔ مغربی سرمایہ داری کے تابوت میں تیزی سے چند اور کیل پیوست ہوتے جاتے ہیں۔ پاؤنڈ کی قیمت میں کئی دفعہ کمی کرنے، اجرتوں میں اضافے پر پابندی لگانے، عالمی بنکوں (یعنی امریکہ اور جرمنی سے) سے اربوں پاؤنڈ قرض لینے، برآمدات کو بڑھانے اور درآمدات کو گھٹانے، ٹیکسوں میں بے شمار اضافہ کرنے اور مشترکہ منڈی میں شامل ہونے کی سرتوڑ کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی یورپ کے سات ممالک پر مشتمل، آزاد تجارت کے حلقہ کے قیام کے باوجود برطانیہ اپنے معاشی بحران سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔

میں نے ان دو سالوں میں یہ دیکھا ہے کہ دوسری سامراجی طاقتوں کی طرح برطانیہ معاشی بحران کی دلدل سے باہر نکلنے کی بجائے اسی میں اور بُری طرح دھنستا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر بے روزگاروں کی کل تعداد (اندازاً چھ لاکھ) میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ ادائیگیوں کا توازن اور بگڑ رہا ہے۔ ہڑتالوں اور صنعتی تنازعات نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کر لی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب کسی بڑی ہڑتال کی خبر نہ آئے۔ مزدوروں میں طبقاتی شعور اس حد تک بیدار ہو چکا ہے

کہ برطانیہ میں بھی انقلابی تحریک کے ابتدائی آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے ارکان تو ہزاروں ہیں اور وہ ایک اپنا روزنامہ (مارننگ سٹار) شائع کرتی ہے مگر ماسکو نواز اور ترمیم پسند ہونے کی وجہ سے وہ محنت کش طبقے کا ہراول دستہ نہیں بن سکی۔ ٹریڈ یونین کانگریس اپنی صد سالہ زندگی کے بعد اس تب تابِ جاودانہ سے محروم ہو چکی ہے جو شروع میں اُسے مزدوروں کی آنکھ کا تارا بنانے کی موجب بنی۔ اب یہ صورتِ حال اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ مزدوروں نے اپنی یونین کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہڑتال کر دی۔ ٹریڈ یونین انجمنیں کافی حد تک یہاں کے معاشی نظام کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب محنت کش طبقے کی صفوں میں نئے انقلابی عناصر ابھر رہے ہیں جن میں ٹراٹسکی نواز انٹرنیشنل سوشلسٹ اور ماؤزے تنگ کے نام لیوا سب سے زیادہ نمایاں، منظم، طاقت ور اور مؤثر ہیں۔ سب سے زیادہ غیر سرکاری (انٹرنیشنل مارکسسٹ گروپ) ہڑتالیں بندرگاہوں اور کار سازی کے کارخانوں میں ہوتی ہیں۔ برآمدات کے کاروبار میں بندرگاہوں کو رگِ جاں کی حیثیت حاصل ہے۔ دوسری طرف کاریں زرِ مبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں اس لیے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں صنعتوں میں کام معطل ہو جائے تو سرمایہ دارانہ نظام پر کتنی کاری ضرب لگتی ہے۔ گودی کے مزدوروں کے انقلابی راہنما جیک ڈیش نے اب یہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ اس کے ایک اشارے پر لندن کی گودیوں پر نقل و حرکت رُک جاتی ہے ۱۸ مارچ کو فورڈ کے کارخانوں میں ہڑتال تین ہفتوں کے بعد بصد مشکل ختم ہوئی۔

فورڈ کو اس ہڑتال سے اندازاً ۵ کروڑ پاؤنڈ کا نقصان ہوا ہے۔ برطانوی معیشت پر امریکی قبضے کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں قریباً سارے بڑے کارخانے یا کلیے کی صنعتوں کے شعبوں کی اکثریت امریکیوں اور وال سٹریٹ کی ملکیت ہیں۔ برطانیہ میں امریکی سرمایہ کاری پانچ سو ملین کے لگ بھگ ہے۔ یورپ کی مشترکہ منڈی میں برطانوی داخلے کو اس وقت فرانس نے جن وجوہات کی بنا پر ویٹو کیا ہے۔ اُن میں سب سے بنیادی یہی ہے۔ فورڈ کی ہڑتال نے امریکی آقاؤں کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ وہ اب برطانیہ سے اپنا سرمایہ نکال لینے اور اپنے نئے منصوبوں کو مغربی جرمنی منتقل کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اور یوں ہم اپنی آنکھوں سے مغربی سرمایہ داری میں دراڑیں پڑتے، اس کے تضادات کو ابھرتے اور اس کے داخلی عملِ تخریب کو تیز تر ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ کارل مارکس اور اینگلز کی بصیرت اور دور اندیشی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان دونوں سیاسی فلسفیوں نے ایک صدی قبل اس عبرت انگیز مشاہدے کی بڑی وضاحت سے پیش گوئی کی تھی۔ مغربی یورپ کے دوسرے خوشحال ممالک کی طرح برطانیہ کو اشتراکیت سے بچانے کے لیے محنت کش طبقے کا معیارِ زندگی اتنا بلند کر دیا گیا تھا کہ وہ اس پر قناعت کر لیں اور سرمایہ داری کو برداشت کرتے جائیں۔ پہلے یہ کارنامہ کروڑوں ایشیائی اور افریقی کسانوں اور مزدوروں کا خون چوس کر سرانجام دیا گیا۔ جب سے نوآبادیاتی نظام نے دم توڑا ہے سرمایہ داری کی نبض بھی اکھڑنے لگی ہے۔ لینن کے قول کے مطابق سرمایہ داری اور نوآبادیات لازم و ملزوم ہیں موجودہ حالات اس قول کی صداقت کی گواہی دیتے آئیں۔ برطانیہ میں مہنگائی اتنی بڑھتی جا رہی ہے کہ اس سے تھوڑی آمدنی والے طبقے کا معیارِ زندگی بُری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ اور اس نام نہاد معیارِ زندگی کے مصنوعی پن اور کھوکھلے پن کا پول کھلتا جا رہا ہے۔ جونہی تیسری دنیا کے ممالک نے صنعتی اور تکنیکی ترقی کر لی۔ امریکہ اور مغربی یورپ کی خوشحال سرمایہ داری کی چمکدار اور خیرہ کن عمارات دھڑام سے نیچے آگرے گی۔

بلجیم کے مشہور مارکسی دانشور ارنسٹ مینڈل نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں سرمایہ دار ملکوں نے اپنے کل صنعتی پیداوار کا چھ فی صد اور برآمدت کا ۱۲ فیصد تیسری دنیا کے ممالک ہاتھ (منہ مانگے داموں پر) فروخت کیا۔ دوسری طرف (سرمایہ داروں کے پروپیگنڈے کے برعکس) سرمایہ دار ممالک میں تیسری دنیا میں پیدا ہونے والے خام مال اور معدنی وسائل پر محتاجی کی حد تک انحصار کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ (اقبال کے الفاظ میں) دنیا جس روزِ مکافات کی منتظر ہے وہ سرمایہ دار ممالک میں بندۂ مزدور کے اوقات میں تلخی پیدا ہونے کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہوگا۔ یہ کوئی دن کی بات ہے جب انسان پر انسان کی خدائی دنیا بھر میں ختم ہو جائے گی۔ نمو اور ترقی کی قوتیں پچھلے بوسیدہ اور فرسودہ نظام کی کوکھ میں سے پھوٹتی ہیں اور نظامِ نو کی بنیاد رکھتی ہیں سماجی ارتقاء کا یہ عمل ایک اٹل قانون کا پابند ہے۔ تمام سامراجی اور ہزاروں مودودی مل کر بھی اس عمل کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتے۔

یونان

یونان کی فاشی اور فوجی حکومت نے اطالوی حکومت سے اس اطلاع کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے کہ اٹلی کی سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر اور موجودہ وزیرِ خارجہ جناب ننی نے یونان کے ایک جلاوطن سیاست دان پروفیسر پاپن ڈریو سے ایک حالیہ ملاقات کے دوران اُسے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ یونانی حکومت کی مخالفت کرنے والے عناصر (جو بیرونِ ملک قیام پذیر ہیں) کی پوری امداد کریں گے۔ معلوم ہوا کہ یونان کی حکومت نے یہ دھمکی دی ہے کہ اگر وضاحت تسلی بخش نہ ہوئی تو وہ اٹلی سے تجارتی تعلقات توڑ دے گی۔ یونان اٹلی سے سالانہ ۴۶ ملین پاؤنڈ کا مال درآمد کرتا ہے جبکہ اس کی اٹلی کو برآمد کی مالیت محض ۱۳ ملین پاؤنڈ ہے۔ داخلی طور پر یونان کے حکمران کرنل صاحبان کو اپنے صحافیوں سے شکایت بڑھتی جا رہی ہے کہ وہ بین السطور فوجی حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ فوجی حکومت کی کھلم کھلا مخالفت کرنے والوں میں مشہور یونانی اداکارہ ملینا مرکوری کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ۱۸ مارچ کو مس مرکوری اٹلی میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرنے گئیں تو اُن کی تقریر سے تھوڑی دیر پہلے سٹیج کے نیچے سے ایک ٹائم بم اور سات پونڈ وزنی بارود برآمد کیا گیا۔ اس بات میں شک نہیں کہ یہ بم فوجی حکومت

کے کسی ایجنٹ نے رکھا تھا۔ مس مرکوری کا کہنا ہے کہ ظالم مگر بزدل حکومت کا مقصد مجھے ہلاک کرانا نہیں بلکہ اپنے بہت سے مخالفین کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔ یونانی حکومت نے مس مرکوری کا پاسپورٹ ضبط کر لیا ہے اس لیے وہ اور اُن کے شوہر اب حکومتِ سوئٹزرلینڈ کے جاری کردہ عارضی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہیں۔ ۵؍مئی کو لندن میں کونسل آف یورپ کے وزراء کا اجلاس ہوگا جس میں یونان کی موجودہ فوجی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا مسئلہ بھی زیرِ غور لایا جائے گا۔ مس مرکوری نے یہ عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ آخری دم تک فوجی حکومت کی مخالفت کریں گی۔ وہ کونسل آف یورپ کے اجلاس میں سیاسی قیدیوں پر ظلم و تشدد کے بہت سے واقعات ثابت کرنے کے لیے گواہان اور دوسری شہادتیں پیش کریں گی۔ انہوں نے اخبار نویسوں کو ایک اعلیٰ فوجی افسر اور ایک بے گناہ سیاسی قیدی کے درمیان مکالمہ کا ایک حصّہ بھی سنایا۔ فوجی افسر "تم ۲۵ سالہ نوجوان ہو۔ ۲۰ برس قید بامشقت بھگتنے کے بعد تمہاری ریڑھ کی ہڈی بھی تمہارے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دے گی۔ اس طرح زندہ درگور ہو جانے کے بعد تمہارا اتنا برا حشر ہوگا کہ تم موت کی دعائیں مانگو گے۔ اس وقت آخر کون تمہاری پرواہ یا نگہداشت کرے گا۔ تمہاری حالت مُردوں سے بدتر ہوگی۔ اور تمہارے جیسے جنونیوں نے موجودہ نظامِ حکومت بدل بھی دیا تو یاد رکھو کہ میں تو بہرحال اس عہدہ پر فائز ہوں گا بلکہ شاید اور ترقی کر جاؤں۔ میری بات مانو تو اپنے 'جرائم' کا اعتراف کر لو۔ ہمیں اپنے ساتھ کام کرنے والے دوسرے خطرناک کمیونسٹوں کے نام اور پتے بتاؤ۔ میں پھر تمہاری جان بخشی کی سفارش کروں گا۔"

اٹلی

ان دنوں اٹلی کی حکومت نے کانٹوں کا تاج پہن رکھا ہے۔ اطالوی جمہوریت کی مشکلات کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں پارلیمانی نظام کارفرما ہے اور کسی سیاسی جماعت کو پارلیمنٹ میں واضح اکثریت حاصل نہیں۔ گذشتہ کئی سالوں کی طرح اس [illegible] بھی حکومت ایک مرکزی اور ایک بائیں بازو کی جماعت پر مشتمل ہے۔ اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی رکنیت کے اعتبار سے یورپ (مغربی) میں سب سے بڑی ہے۔ وہ حکومت کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی پوزیشن مضبوط کر رہی ہے۔ حکومت کے مصائب مندرجہ ذیل ہیں۔ طرح طرح کے سکینڈل — زبردست ہڑتالیں اور طلباء کی بغاوت۔ سکینڈلوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ وہ بنکوں، انتظامیہ اور خفیہ پولیس سے لے کر عدلیہ تک کو ملوث کرتے ہیں۔ کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کے سیکرٹری نے کہا ہے کہ اٹلی پچھلی نصف صدی میں (فاشزم کے بعد) کبھی اتنے بڑے داخلی خلفشار میں مبتلاء نہیں ہوا۔ اٹلی کے نو دولتیوں میں سرِ فہرست میں ایک ۲۳ سالہ کروڑپتی ہے۔ اس پر جعل سازی کر کے اپنے ایک کاروبار کو دیوالیہ کر دینے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا کہ وہ پولیس اور مجسٹریٹ کو رشوت دے کر ضمانت پر رہا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ وزارتِ داخلہ کے افسروں کی مٹھی گرم کر کے ملک سے باہر نکل آیا۔ اور ایک ماہ سے بیروت کے بہترین ہوٹل میں مقیم ہے۔ پاکستان کے سرمایہ داروں کی طرح اس اطالوی کروڑپتی نے بھی سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں اتنی دولت جمع کرائی ہوئی تھی کہ وہ اس کے لیے ساری زندگی عیش و عشرت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اٹلی کا سب سے موقر روزنامہ "لاسٹامپ"، اگرچہ اس امیر گھرانہ کی ملکیت ہے جو مشہور کمپنی فیٹ کی مالک ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے ادارتی نوٹ میں مذکورہ واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "امیر اور غریب کے لیے حکومت کا ضابطۂ قوانین مختلف ہوتا ہے۔ غریبوں کے لیے قانون کی زنجیریں، امیروں کے لیے مکڑی کے جالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جب تک تمیزِ بندہ و آقا کو قائم رکھا جاتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں فسادِ آدمیت کا موجب بنتی رہے گی۔" اب آپ دوسرے سکینڈل سنیئے۔ پچھلے سال اٹلی کی خفیہ پولیس کے سربراہ کو اس الزام میں برطرف کر دیا گیا تھا کہ وہ بہت سی اہم سرکاری فائلیں گم کرنے اور مرکزی حکومت پر طاقت کے ذریعے قبضہ کرنے کی پُراسرار سازش میں شریک تھا۔ انتہائی دائیں بازو کی جماعت نے اس شخص کو ایک غیر محفوظ نشست سے کامیاب کرا کے ایوانِ زیریں کا رکن بنوا لیا ہے۔ موصوف نے انتقامی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ۱۲ جرنیلوں پر اہم فوجی راز افشا کرنے کا الزام لگایا ہے۔ اُدھر ایک بنک میں تین کروڑ پاؤنڈ کے خرد برد کی تفتیش جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہے۔ وزیروں کے علاوہ کئی پردہ نشینوں کے نام بھی منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ پارلیمان کے چھ ارکان پر پانچ لاکھ پاؤنڈ کے ناجائز استعمال کا الزام عائد کیا جا چکا ہے (یہ رقم سرکاری خزانہ سے نکلوائی گئی تھی) ایک سائنس دان پر یہ الزام ہے کہ وہ خلائی تسخیر کے متعلق تحقیق کے لیے وقف رقوم کو خود ہضم کر گیا۔ بجلی اور گیس کی سرکاری کمپنی کے چند ڈائریکٹروں پر ۷۰ ہزار پاؤنڈ غبن کرنے کا الزام ثابت ہو چکا ہے۔ مارچ کے آخری ہفتے میں دنیا کی قانونی تاریخ میں اپنی قسم کا نیا واقعہ بھی اٹلی میں رونما ہوا۔ ۷۰۹ سرکاری ملازم اس جرم میں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں کہ انہوں نے تھوک کے بھاؤ مجرموں کے ایک ٹولے کے ہاتھ ڈرائیونگ لائسنس فروخت کر ڈالے تھے۔ ملزموں کی طرف سے ۳۰۰ وکیل پیش ہو رہے ہیں۔ اس دلچسپ مقدمے کی سماعت کے لیے وزارتِ انصاف نے پچاس ہزار روپے ماہانہ کرایہ پر ایک سٹیڈیم لیا ہے (چند سال پہلے اس سٹیڈیم میں ایک عالمی نمائش منعقد ہوئی تھی)۔ اٹلی کا شمار یورپ کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں طبقاتی کشمکش بڑی تیزی سے شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ جنوب میں کسان اور شمال میں مزدور — اور سارے کالجوں میں طلباء اور طالبات — ان کی صفوں میں سے نئے انقلابی عناصر اُبھر رہے ہیں۔ مغربی یورپ کی دوسری پارٹیوں کی طرح اٹلی کی کمیونسٹ پارٹی بھی ماسکو نواز اور ترمیم پسند ہے اور عوامی انقلاب لانے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ مگر اب اٹلی میں سُرخ جھنڈوں کو تھامنے کے لیے اور ہاتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

نصرت — کا سالانہ چندہ — ۱۵/ روپے

محمد صفدر میرؔ

مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش (۳)

سیاسی اور معاشی قلابازیاں

ایک "حق گو" صاحب نے ہفت روزہ "جہاں نما" کے ایک حالیہ شمارے (مطبوعہ ۲۱، مارچ) میں مودودی صاحب اور مودودی جماعت کے دفاع میں مضمون لکھتے ہوئے اس خاکسار کو چند پند مرحمت فرمائے ہیں۔ میرے درگزشتہ مضامین کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ہمیں "خوف خدا سے کام لینے" اور "سید مودودی" اور اُن کی جماعت پر "ظلم ڈھانے" سے باز رہنے کی "تلقین" بڑے پُرزور الفاظ میں کی ہے۔

ہم اس پند و نصائح کے دفتر کا کوئی نوٹس نہ لیتے اگر "حق گو" صاحب نے اپنے مضمون کی آخری سطور میں مودودی صاحب اور مودودی جماعت کی خاص روایت کے مطابق ہمیں کچھ دھمکیاں نہ دی ہوتیں۔ یہ صحیح ہے کہ "حق گو" نے مودودی صاحب کی طرح کہیں یہ نہیں کہا کہ "اے میر صاحب! آپ کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔" لیکن اتنی تنبیہہ ضرور کی ہے کہ "بے بنیاد باتوں کو سید مودودی سے منسوب کرنے کی روایت اب ختم ہو جانی چاہیئے۔ یقین ہو کہ ایسی ہر روایت کو مٹا دیا جائے گا۔ خواہ اس کی زد میں کوئی آتا ہو۔"

ہم نہیں جانتے کہ ان نقاب پوش "حق گو" صاحب کے پردۂ زنگاری میں کون بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ وہ کوئی بھی ہوں، ان کی خدمت میں بصد نیاز عرض ہے کہ اس قسم کی گفتگو شرفاء کا دستور نہیں ہے۔ اگر اس ایچ میرز کو "مٹا دینے" سے یا کم از کم "مٹا دینے" کی دھمکی دینے سے آپ کا یا مودودی صاحب کا کوئی کام نکل سکتا ہو تو بندہ حاضر ہے۔ لیکن محض "مجھے" "مٹانے" سے یا "مٹا دینے" سے کیا خلقِ خدا ختم ہو جائے گی؟ اور مودودی جماعت اور مودودی مذہبِ فکر ("یا مذہبِ فکر" کی ترکیب مودودی صاحب کی اپنی ہلکی سی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے، میری نہیں) کے متعلق خلقِ خدا پنہاں اور آشکارا پچھلے ۲۵ برس سے کہتی چلی آ رہی ہے کیا وہ سب جھوٹ ثابت ہو جائے گا۔ کیا آپ کے "مٹا دینے" کے اعلان کی "زد میں" وہ تمام علمائے کرام بھی نہیں آجاتے جن کے مبسوط حوالوں پر میرا وہ دوسرا مضمون مشتمل تھا جس پر آپ کو اتنا تاؤ آیا ہے۔

اے "حق گو" صاحب! یقین ہو — اور مکرر یقین ہو — کہ ابھی میں نے مودودیت اور مودودی جماعت کی سیاست کے بارے میں اپنا استدلال پیش نہیں کیا ہے۔ میں نے تو محض یہ کہا ہے کہ غلط بحث سے اپنے آپ کو اور پڑھنے والوں کو بچانے کے لیے یہ کلیہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مودودی جماعت ایک خالصتاً سیاسی جماعت ہے جس کا مقصد دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح اور اُن کے ساتھ سیاست کے میدان میں مسابقت اور مقابلہ کر کے ایوانِ حکومت پر قبضہ کرنا ہے" اور اس لیے کسی "عامی" کی طرف سے اس جماعت کے مذہبِ فکر، اس کے پروگرام اور طریقِ کار پر نقد و نظر کرنا اسلام پر جرح کرنے کے مترادف نہیں ہو سکتا۔"

اے "حق گو" صاحب! کیا سیاسی جماعتوں اور ملک کی سیاست پر نقد و نظر کا "حق" صرف آپ کو حاصل ہے یا مودودی صاحب اور ان کے رفقائے کار کو حاصل ہے؟ کیا مودودی صاحب اور مودودی جماعت پر نقد و نظر خدا اور اس کے رسولؐ پر نقد و نظر ہے؟ میں فقیہہ نہیں کہ آپ کو "فقہی حدود کے اندر" مسلمان تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا اعلان کروں جیسا کہ آپ نے اپنے مضمون میں مجھے تسلیم کر کے میری عزت افزائی کی ہے۔ میرا منہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اپنے ہم کلاموں کو مسلمان اور نامسلمان کی ڈگریاں دیتا پھروں جیسا کہ مودودی صاحب اور اُن کے رفقاء پچھلے ۲۵ برس سے کرتے آئے ہیں۔ کیا مودودی صاحب کے یہ کہنے سے کہ قائد اعظم اور ان کی جماعت کے اکثر و بیشتر اصحاب کو مسلمانی سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے، ان عظیم ہستیوں کی مسلمانی خطرے میں پڑ گئی تھی؟ مسلمان گری اور کافر گری کا یہ دعوای آپ کو زیب نہیں دیتا ورنہ جن لوگوں کو "مٹا دینے" کا آپ نے اعلان فرمایا ہے ان میں سے ہر فرد آپ کا دامن گیر ہوگا۔

میں نے اپنی طرف سے گزشتہ مضمون میں کچھ بھی نہیں لکھا تھا اس لیے کہ میں ایک سیدھا سادا صحافی ہوں۔ نہ عالمِ دین ہوں نہ فقیہہ اور دین کے معاملے میں اپنی رائے کو دخل در معقولات سمجھتا ہوں۔ میں نے مودودی صاحب اور مودودی جماعت کے بارے میں بعض ایسے علماء کی آراء محض نقل کر دی تھیں جن کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ عام لوگوں کو دھوکا دیں گے۔ ان کے اسمائے گرامی میں دوبارہ نقل کرتا ہوں: جناب مولانا حسین احمد مدنی صاحب، جناب مولانا احمد علی صاحب، جناب محمد منظور حسینی قاسمی صاحب، جناب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب، جناب مولانا محمد علی صاحب جالندھری،

کے کر

جناب مولانا لال حسین اختر صاحب، جناب مولانا انیس الرحمٰن صاحب، جناب مولانا عبداللہ صاحب (خیر المدارس ملتان) جناب مولانا عبدالحق صاحب (دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)، جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، جناب مولانا محمد صادق صاحب۔

اے "حق گو" صاحب! کیا آپ ان سب حضرات کو "مٹا دیں گے"؟ کیونکہ مودودی صاحب اور مودودی جماعت کے اصل ناقد یہی ہیں۔ میں تو محض ان کی آراء کو نقل کرنے کا گنہگار ہوں۔ اگر آپ کی دھمکی میں کوئی دم ہے تو پہلے ان حضرات کو "مٹا کر" آیئے ۔ میں اس سلسلے میں آپ کی خصوصی توجہ کا بہت ہی حقیر ہدف ہوں۔ ویسے اگر محض ان علماء کی رائے کو نقل کر دینے سے آپ پر "میرا مٹا دینا" واجب ہو گیا ہے تو "سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے"۔ میں "مٹا دیے جانے" کے لیے تیار ہوں۔ جب آپ کا جی چاہے آیئے اور مجھے "مٹا دیجیے"۔

آپ کی نظر میں یہ "امر بھی حیران کن ہے کہ آپ (یعنی ہم) مولانا حسین احمد مدنی کے حوالے دے رہے ہیں۔" کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ لوگ "پچھلے بیس برس سے مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہم کو تحریکِ پاکستان پر گفتگو کرتے ہوئے کیا کیا کہتے رہے ہیں؟" اے "مردِ حق گو"! اس "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والے استدلال کا یہ کیا مقام تھا۔ میں نے یہ کہاں کہا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی کی سیاست مجھے مرغوب ہے یا نہیں ـــــ بات یہ ہو رہی تھی اے حضرتِ حق گو! کہ علمائے کرام نے مودودی صاحب کے بارے میں کیا کہا ہے، قطع نظر اس کے کہ ان کی اپنی سیاست سے ہم اتفاق کرتے ہیں یا نہیں۔ میں نے جناب مدنی کے ضمن میں یہ نہیں لکھا تھا کہ ان کی سیاست سے مجھے اتفاق ہے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ "سیاسی اختلافات رکھتے ہوئے بھی ان کے ممتاز ترین دینی عالم ہونے کے منصب سے کسی کو اختلاف کی گنجائش نہ ہو گی۔"

بہرحال اگر میں آپ کے طرزِ استدلال کو اپناؤں تو آپ کے طعنے کے جواب میں یہ بھی لکھا جا سکتا ہے کہ آج قائداعظم کے بارے میں عقیدت کا اظہار اپنی تقریر و تحریر میں کرتے ہوئے کیا آپ کو (یعنی مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کو) یاد نہیں رہا کہ آپ لوگ پچھلے تیس سال سے قائداعظم اور ان کے مقتدر رفقاء اور اُن کے سیاسی مسلک کے بارے میں تحریکِ پاکستان پر گفتگو کرتے ہوئے کیا کیا کہتے رہے ہیں اور اُن پر کیا کیا ظلم ڈھاتے رہے ہیں؟

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

مودودی صاحب کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش"۔ اس کے پہلے دو حصّوں کو حال ہی میں اُنہوں نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اور اس کے مضامین کو اس امر کی شہادت کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے مخالفین میں نہیں تھے بلکہ اُنہوں نے تو تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ کتاب کے ان پہلے دو حصّوں کا مفہوم وُہی ہے جسے عُرفِ عام میں دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے اور جسے سرسید احمد خانؒ سے لے کر حالی، اکبر، حسرت موہانی، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور قائداعظم تک سبھی دُہراتے رہے ہیں یعنی یہ کہ مسلمان اور ہندو دو الگ قومیں ہیں۔ اب اگر محض اس ہزار بار دُہرائی ہوئی بات کو مودودی صاحب نے "سیاسی کشمکش حصّہ اوّل و دوم" میں پھر دُہرایا ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے موجد تھے؟ یا اس کے حامی تھے؟

عجیب بات یہ ہے کہ اس کتاب کا حصّہ سوئم آج کل بازار میں نہیں ملتا۔ میرے پاس جو نسخہ ہے وہ میں نے تین چار سال پہلے خریدا تھا۔ یہ کتاب کا ساتواں ایڈیشن ہے جو ۱۹۵۵ء میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد مودودی جماعت نے غالباً مصلحت کے طور پر اس کا شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بہرحال ۱۹۵۵ء کے ایڈیشن میں اس کتاب کی یعنی "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصّہ سوئم کی اہمیت پر اصرار کرتے ہوئے مودودی صاحب نے یہ لکھا ہے "خصوصیت کے ساتھ یہ کتاب اس لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہی دراصل "جماعت اسلامی" کا سنگِ بنیاد ہے۔" ہے نا عجیب بات کہ جو کتاب ۱۹۵۵ء میں مودودی صاحب کی اپنی جماعت کا سنگِ بنیاد تھی اُسے وہ آج لوگوں کی نظر سے اس قدر محنت سے چھپا کر رکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہر عمارت کے سنگِ بنیاد پر امتدادِ زمانہ سے خاک کی تہیں جم جاتی ہیں لیکن ایسا بھی کیا ـــــ کہ چودہ ہی سال میں سنگِ بنیاد زیرِ زمین (سیاسی اصطلاح میں انڈر گراؤنڈ) چلا جائے اور کسی مخالف کا سر پھوڑنے کے کام بھی نہ آ سکے۔

پچھلے وقتوں میں مودودی صاحب اور ان کے رفقاء اس بات کا بھی اعلان کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے کہ "انہوں" نے ـــ اور ان کی جماعت "مصلحین" نے پاکستان کی تحریک میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

> "خدا کا شکر ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو حالات کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر نہ صرف حال بلکہ ماضی کو بھی تبدیل کر دیتے ہیں۔ ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے۔ اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں۔ اور اس میدان میں کسی حصّے کا اپنے آپ کو دعوے دار نہیں سمجھتے۔" (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۳ء اشارات از عبدالحمید صدیقی)

لیکن آج کل یہی حضرات قوم سے یہ منوانے پر تلے ہوئے ہیں کہ اگر پاکستان بنانے کے لیے کسی نے کوئی کام کیا ہے تو وہ مودودی صاحب ہیں یا مودودی جماعت۔ اور اسی لیے شاید وہ "سیاسی کشمکش حصّہ سوئم" کو دوبارہ چھاپنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب ـ جماعت اسلامی کے اس سنگِ بنیاد ـــ کی ہر سطر میں تحریکِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان اور اس کے رفقاء کے متعلق طعن و تشنیع کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں جیسے اسلوب میں جو مودودی صاحب سے مخصوص ہے، ایسے شدید حملے کیے گئے ہیں۔

کہ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا مودودی قائد اعظم کے بنائے ہوئے پاکستان میں کس منہ سے سر چھپانے چلے آئے۔ مختصراً اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ مودودی صاحب اور مودودی جماعت محض "تقسیم ملک کی جنگ سے غیر متعلق" ہی نہیں رہے ہیں بلکہ اس کے سب سے بڑے مخالف اور دشمن بھی رہے ہیں۔ لیجئے چند "صلح اقوال" مشتے نمونہ از خروارے نقل کرتا ہوں کہ نقلِ کفر کفر نباشد۔ معلوم نہیں اسے "حق گو" صاحب کے مودودی صاحب کی طرف سے قائد اعظم، تحریک پاکستان، مسلم لیگ اور مسلم لیگ کے عمائدین پر یہ حملے "ظلم" کہلا سکتے ہیں یا نہیں کہ اُورا "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم می گویند"۔

"اس نئی تحریک کے دور میں (یعنی مسلم قومیت اور پاکستان کی تحریک کے دور میں) عامۃ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اور اس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں۔" صفحہ ۱۳

"افسوس کہ لیگ کے بڑے لیڈروں سے لے کے چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ (یعنی قائد اعظم اور ان کے رفقاء) مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔" صفحہ ۵۲، ۵۳

"ان کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظامِ معاشرت سے وابستہ ہیں۔ انہی کے گروہ کے کچھ لوگ ان کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور ان کی جدوجہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے اور جو کچھ مزید ہاتھ آ سکتا ہو وہ آ جائے۔ (صفحہ ۶۲)

آج مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی نئی صوابدید ان سے یہ کہلواتی ہے کہ پاکستان کی تحریک ان کے خاص "مذہبِ فکر" کے اصولوں پر ہی چلائی گئی تھی حالانکہ ۱۹۴۱ء میں لکھی گئی یہ کتاب اعلان کرتی ہے کہ تحریکِ پاکستان کا مقصد مسلمانوں کی قومی ریاست کا حصول تھا۔

"خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات و رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دُنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقا کے میدان میں اُتریں اور انتخابِ طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔" صفحہ ۶۴

یعنی ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک ایک "نسلی گروہ" کی تحریک ہے۔ "ایک جماعت کے موروثی عادات و رسوم" کو قائم رکھنے کی تحریک ہے۔ "دنیا کے معاملات میں چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت" کی تحریک ہے۔ انسانیت کے گروہوں میں سے "ایک اور گروہ کے اضافے" کی تحریک ہے۔ "تنازع للبقا کے میدان" اور انتخابِ طبیعی کے امتحان" میں "انسانی جماعتوں کو جانور" بنانے کی تحریک ہے۔ اس لیے "غیر اسلامی" ہے۔

"اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو (صفحہ ۱۳، صفحہ ۶۲ اور ۶۴ پر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک ایسی ہی قومی تحریک ہے، صفدر میر) .... تو اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دُنیا میں بس ایک اور مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائے گی۔" صفحہ ۷۱

صفحہ ۸۰ تک کے مضامین پر (جو ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں ترجمان القرآن میں چھپتے رہے تھے اور جن میں سے مندرجہ بالا اقتباسات لیے گئے تھے) ایک صاحب نے لکھا۔ "ایک صاحب نے لکھا ہے کہ اب آپ نے ان دو تحریکوں اور اُن کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت (یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت) کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں۔ یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ..... آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی آپ ساتھ دینا نہیں چاہتے۔" صفحہ ۸۲، ۸۳

اس سوال کے جواب میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"اسلام کی رُو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت کو قائم کرنے اور قانونِ انسانی کی جگہ قانونِ خداوندی کو حکمران کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہے (یعنی مسلم لیگ) وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہ ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ جو تنظیم فاشستی اصولوں

پر کی جاتے (یعنی خاکسار تحریک) اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ اور تمکن ہو اُسے محض اس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے "استخلاف الارض" کے لیے کوشاں ہے ..... وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقویٰ اور دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔" صفحہ ۹۳، ۹۴

یہ مودودی صاحب کے اسلوب کا کمال ہے کہ قائداعظم یا علامہ مشرقی اور مسلم لیگ یا خاکسار تحریک کا نام لیے بغیر کس خوبصورتی سے — اور بغیر ابہام کے — ان قائدین اور تحریکوں کو اسلام سے باہر کر ڈالا ہے۔

مسلم لیگ کے آیڈیل اور اس کے موقف کے بارے میں گفتگو فرماتے ہوئے (بغیر نام لیے) مسلمانوں کے قائدین کا ذکرِ خیر یوں فرماتے ہیں :

"وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے — — جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفے کے سرخیل ہیں (لفظ "طائفہ" میں جو طنز چھپی ہوئی ہے اس پر غور کیجیے جناب "حق گو" صاحب۔ مدیر) ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جا نماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دوفی صد سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔ الا ماشاء اللہ۔" صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴

اس سے مودودی صاحب کیا استخراج فرماتے ہیں؟ وہ نہیں وہ اور اُن کے مقلدین آج مسلمانوں کو اپنے خاص "مذہبِ فکر" کے پراپیگنڈے کے سلسلے میں بتاتے پھرتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں مودودی صاحب کو تحریکِ پاکستان اور مسلم لیگ میں اسلام کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا تھا۔ جو نظر آتا تھا وہ یہ ہے :-

"یہی دورنگی اور گندم نمائی اور جو فروشی ہے (یعنی مسلم لیگ کے قائدین کی) جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے۔ اور تہذیب و مذہب کو محض مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنالیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں۔ زبان سے کہیے کہ دِل میں درد ہے مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچتے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دِل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑ جاتی ہے اور دوسری قوموں کے دِل سے اس کا رُعب اٹھ جاتا ہے۔" صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵۔

قطع نظر اس بات کے کہ مسلم لیگ کی تحریک سے قوم کی ہوا اُکھڑی یا جمی اور قائداعظم کی قیادت سے دوسری قوموں کے دِل سے مسلمان قوم کا رُعب اُٹھ گیا یا گہرا ہو گیا، ہم چلتے چلتے یہ بھی پوچھتے چلیں کہ آج جو آپ کو مسلمانوں کی قومی تحریک اور پاکستان تحریک میں معاشی اور سیاسی مسائل کا کوئی سُراغ نظر نہیں آتا تو ۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۰ء بلکہ ۱۹۵۵ء تک آپ یہ راگ کس خوشی میں الاپ رہے تھے کہ "مسلم لیگ کے سامنے اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے۔"

۶۵ء کی جنگ ستمبر کے موقع پر مودودی صاحب دو قوموں کی لڑائی میں ایک قوم کی جدوجہد کے پیچھے خدا کے ہاتھ کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں لیکن جس وقت اس قوم نے ایک دوسری قوم کے خلاف جدوجہد شروع کی تھی، جس کی ایک کڑی ۶۵ء کی جنگ ہے تو وہ خدا کو، اپنی طرح، غیر جانبدار پاتے تھے۔

"کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلے میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانین طبعی کے مطابق اپنا جتھا بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے؟"

مودودی صاحب اور ان کے رفقاء آج مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" کا بہت ذکر کرتے ہیں اور اسی کی طرف سے مخاطب ہوتے ہیں اور "اس سوادِ اعظم" کا اطلاق جمہور مسلمین کی اکثریت پر کرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ ۱۹۳۹ء میں جب پہلی اکثریت قائداعظم کے پیچھے چل رہی تھی تو اس کو یہ مقام دینے کا تصور بھی انہیں "دھوکا" معلوم ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں :

"بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبویؐ کی سراسر غلط تعبیر ہے۔"

اس کے بعد بتایا ہے کہ کس قسم کے مسلمانوں کی اکثریت کا نام سوادِ اعظم ہے۔ پھر فرض کر لیا ہے کہ مسلم لیگ میں شامل مسلمانوں کی اکثریت ان صفات سے عاری ہے۔ لہٰذا

"جو لوگ ان ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو ان کے "ہلڑ" کا نام ہرگز سوادِ اعظم نہیں ہے۔ نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے۔ نہ اُن کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے "امارت" ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکا کھا کر جو

لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔" صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

اسی "ہٹلر" نے اور اسی "جماعت" "امارت" "تنظیم" نے جس کو مودودی صاحب نے "نہ سوادِ اعظم" سمجھا، نہ "جماعت" نہ "امارت" نہ "تنظیم"۔ اس نے پاکستان بنایا تاکہ مودودی صاحب پاکستان بنانے والوں کی کند ذہنی پر ماتم کرنے کے لیے ۱۹۴۷ء میں پٹھانکوٹ سے لاہور تشریف لائیں۔ سو وہ ماتم اب تک جاری ہے۔

آج کل مودودی صاحب ڈکٹیٹر شپ کے مقابلے میں جمہوریت ـــ خالص اور سیدھی سادی پارلیمانی جمہوریت ـــ کے بہت بڑے داعی ہیں لیکن سنیئے کہ ہمارے ملک میں برطانیہ کی مطلق العنان بادشاہی کے زمانے میں آپ کیا فرماتے ہیں:۔

"ڈکٹیٹر شپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا ظلم اور بغض اور فساد فی الارض سے وہ ممالک خالی ہیں جن میں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟ ..... امپریلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ یہی نا کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی مٹ جائے گی" صفحہ ۱۱۴-۱۱۵

آج کل مودودی جماعت کے ڈھنڈورچی عوام اور جمہور کی حاکمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ تحریکِ پاکستان جو جداگانہ مسلمان قومیت اور جمہوریت کے اصولوں پر چلائی گئی تھی، اپنی ابتداء اور عروج کے زمانے میں انہی جمہوریت کے دعویداروں کے نزدیک مغضوب علیہ ٹھہری تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ("حقیقی" کے لفظ پر غور کیجیے) جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغانی حکمران ہیں.... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان کے جس حصے میں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔" صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی کی حکومت سے نکلنا تو صرف لا الٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلے کا انحصار اس نفی پر نہیں ہے اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کن چیزوں کا ہوگا۔ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی

ـــ اور مجاہدینِ حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ نہیں ہے ـــ کہ امپریلزم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بت خانۂ خلوت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک دراصل اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔" ص ۱۲۷

مودودی جماعت اور اس کے مستقل فرمانروا نے پچھلے تیس سال میں کئی چولے بدلے ہیں اور کئی قلابازیاں کھائی ہیں۔

ـــ آغاز کار میں حبِ وطن اور حبِ قوم کو شرک ٹھہرایا۔ لیکن جب ایک آزاد وطن اور آزاد قوم کی جدوجہد میں عوامی تحریک کی فتح ہوئی تو وطن اور قوم کے نام پر اپنا حصہ مانگنے آموجود ہوئے۔

ـ جمہوریت اور جمہور دوستی کو، جو مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی اساس تھی، ربِ ذوالجلال کی حاکمیت کی نفی ٹھہرایا۔ "سیکولر" کا ترجمہ "لادینی" کیا۔ محض "جمہوریت" کو لادینی جمہوریت قرار دے کر عوام کو اس سے متنفر کرنے کی کوشش کی۔ آج اسی "لادینی جمہوریت" کا پرچم بلند کر کے ایک ایسی تحریک میں شمولیت اختیار کی جس میں سلطانیٔ جمہور ہی بنیادی قدر ہے۔

ـــ ایک زمانے میں پاکستان کو "ناپاکستان" کا نام دے کر تحریک پاکستان کو کفر کی تحریک قرار دیا تاکہ مسلمان اس میں حصہ نہ لیں۔ آج برسوں بعد یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کے اصل محرک اور موجد تو ہم ہی تھے۔

ـــ ایک زمانے میں قائد اعظم کو "کافرِ اعظم" کا خطاب دیتے ہیں۔ آج کل ان کے عقیدتمندوں کی صفِ اول میں بیٹھنے پر اصرار کرتے ہیں۔

ـــ ایک زمانے میں عامۃ المسلمین کو محض "نسلی" مسلمان بتا کر انہیں ہندوؤں اور سکھوں کی سطح پر رکھتے تھے اور خود کو "اصلی" اور "حقیقی" مسلمان بتاتے تھے۔ آج انہی مسلمانوں کو قرآن حکیم جلانے کے فرضی سانحہ کی بنیاد پر آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ـ اپریل ۱۹۴۸ء میں حکومت پاکستان کی افواج میں بھرتی کی مخالفت کی، ایک ایسے نازک وقت میں جب ہمیں اپنی نئی ریاست کو بچانے کے لیے حربی طاقت کی اشد ضرورت تھی۔ جب اس مذموم رویے پر لعن طعن ہوئی تو اپنے حکم کی تاویل شروع کر دی۔

ـ مئی ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر میں حصہ لینے کو ناجائز بتایا اور اس کی توجیہہ یہ پیش کی کہ حکومت ہند اور حکومت پاکستان میں معاہدانہ تعلقات قائم تھے۔ اس کے دو مہینے بعد رائے عامہ کی سخت مخالفت کے پیش نظر "معاہدانہ تعلقات کے باوجود پاکستان کے لیے جہادِ کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز" ٹھہرا۔

ـــ ۱۹۳۸ء میں مودودی صاحب سیاسی پارٹی بنانے کے عمل کو "جمعیت کے کمزور کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے احیاء و ترقی کا زمانہ تھا۔ جب قائد اعظم کی مساعی سے مسلمانوں کی جمعیت مضبوط ہو گئی تو مودودی صاحب نے مسلم لیگ اور قائد اعظم اور پاکستان کے خلاف کام کرنے کے لیے اپنی سیاسی پارٹی بنا لی۔

ـــ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء میں مودودی صاحب نے انتخابات میں حصہ لینے سے انکار

کر دیا کیونکہ ان کی نظر میں "امیدواری" اور انتخابی پروپیگنڈا "غیر اسلامی" حرکات تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے "مناسب امیدواروں" کو ووٹ دینے اور دلانے کا وعدہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں اپنی سابقہ پالیسی پر خطِ تنسیخ پھیر کر اسی "غیر اسلامی" چیز یعنی "امیدواری" کو اسلامی بنا لیا۔

آج کل مودودی صاحب اور مودودی جماعت اپنے مخالفین پر "تشدد" اور "خونی انقلاب" کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے کی خواہش کا الزام لگاتے ہیں۔ لیکن اپنی "اسلامی ریاست کی تشکیل" کا طریقہ بتاتے ہوئے وہ ایک عرصے سے اعلان کرتے آئے ہیں کہ

"جب صالحین کا گروہ منظم ہو، اہلِ ملک کی اکثریت ان کے ساتھ ہو، یا کم از کم اس بات کا ظنِ غالب ہو کہ عملی جد و جہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دیگی اور کسی بڑی تباہی اور خونریزی کے بعد مفسدین کے اقتدار کو ہٹا کر صالحین کا اقتدار قائم کیا جا سکے گا۔ اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف یہ حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کر کے ملک کے اندر بزورِ شمشیر انقلاب پیدا کر دیں اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔"

یاد رہے کہ "صالحین" سے یہاں مراد مودودی صاحب اور ان کے رفقا ہے اور "مفسدین" سے مراد وہ تمام مسلمان جو ان کے ساتھ ان کے نئے "مذہبِ فکر" کے سلسلے میں اتفاق نہیں رکھتے۔

مودودی جماعت کی قلابازیاں گنوانے سے ہماری مراد محض یہ ثابت کرنا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مودودی صاحب اپنے موقف کو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے نئے "مذہبِ فکر" کو بقدرِ ضرورت بدلتے آئے ہیں اور آئندہ بھی بدلتے رہیں گے۔

ان کی سیاسی جد و جہد کا منتہائے مقصود "اقتدار کی کنجیوں" پر قبضہ کرنا ہے۔ اُن کی حکمتِ عملی کا تقاضا ہے کہ اپنی ہر آرزو اور ہر خواہش کا نام "اسلام" اور "شریعت" رکھیں۔ اُن کے طریقِ کار کی اساس یہ ہے کہ نیک مقصد کے لیے (اُن کا ہر مقصد نیک ہوتا ہے خواہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت ہو یا قائد اعظم پر بہتان و افترا کی بارش) جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کوئی اصول اٹل اور پائیدار نہیں ہوتا۔ ایک وقت میں زمانے کے حالات اور رائے عامہ کے رجحان کو دیکھتے ہوئے کوئی چیز عینِ اسلام ہو سکتی ہے تو وہی چیز بدلے ہوئے حالات میں غیر اسلام ہو سکتی ہے۔

ایک عرصے تک مودودی جماعت کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری اسلام کی رُو سے بالکل جائز ہیں اور لامحدود حقِ ملکیت تو گویا اسلامی معیشت کا بنیادی ستون ہے۔ اس لیے بعض حضرات کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی ہے کہ حال ہی میں جماعت کی طرف سے "ان مسلّمہ اسلامی اصولوں" کی نفی ایک نئے معاشی پروگرام کی صورت میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ مودودی جماعت کی اس نئی قلابازی کی مختلف توجیہات کی جا رہی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رائے عامہ کے زبردست دباؤ کے زیرِ اثر مودودی صاحب نے اپنی گذشتہ سیاسی زندگی پر خطِ تنسیخ پھیر دیا ہے۔ بعض اور اصحاب "اس تبدیلی" کو ایک نیا دامِ ہمرنگِ زمین قرار دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ نیا جال لائے پرانے شکاری۔

مودودی جماعت کے ارکان اور حواری یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ دیکھیے حضرات اسلامی سوشلسٹ ہم پر جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کا الزام لگاتے تھے وہ کتنا غلط اور بے بنیاد نکلا۔ ہم تو محض خالص "اسلامی" طریقوں سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے "اسلامی" نظامِ معیشت کے ہوتے ہوئے اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ پاکستان میں سوشلزم کا نام لیا جائے۔ چاہے قائد اعظم اور علامہ اقبال کو اس کی حمایت ہی حاصل ہو۔ آخر جو اصلاحات اسلامی سوشلسٹ یہاں لانا چاہتے ہیں کیا وہی اصلاحات ہم "اسلامی" نظامِ معیشت کے ذریعے نہیں لا سکتے ہیں۔

مودودی صاحب کے "صالح" ڈھنڈورچیوں کے اس پراپیگنڈے کا ایک جواب تو یہی ہے کہ صاحب اگر آپ کا "اسلامی" نظامِ معیشت بھی وہی اصلاحات چاہتا ہے جن کی ضرورت کا اعلان اسلامی سوشلزم کے حامی ایک مدت سے کر رہے ہیں تو آپ نے ان کے خلاف لڑائی کس سلسلے میں ٹھان رکھی ہے؟ آپ اسلامی سوشلسٹ نوجوانوں پر حملے کیوں کرتے ہیں؟ اُن پر طرح طرح کے الزام تراش کر عوام کو ان کے خلاف کس خوشی میں اُکسا رہے ہیں؟ محض سوشلزم (جس کا ترجمہ اجتماعیت ہے) کا نام لے لینے سے کوئی کام کیونکر غیر اسلامی ہو جاتا ہے جب کہ آپ خود اسی کام کو "اسلامی" نظام کہہ کر پیش کر رہے ہیں۔

لیکن دراصل قصہ کچھ اور ہے۔ مودودی صاحب نے کوئی ایسی نئی بات نہیں کی جو پہلے سے نہ کرتے آئے ہوں۔ نیا پروگرام وہی پرانا پروگرام ہے جس میں سوشلزم کے حق میں بڑھتی ہوئی رائے عامہ کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے ایک جزوی سی تبدیلی کی گئی ہے۔

اس "نئے" پروگرام میں متنازعہ فیہ بات صرف اتنی معلوم ہوتی ہے (صرف معلوم ہوتی ہے، دراصل ہے نہیں) کہ جن صنعتوں کو کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے ... اُن کو قومی انتظام میں دے دیا جائے۔ دوسری بات جس کا ڈھنڈورا زور زور سے پیٹا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ زمین کا حقِ ملکیت محدود کر دیا گیا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ مودودی جماعت نے زمین کی ملکیت کی کوئی مستقل حد قائم نہیں کی ہے بلکہ یہ "حد" ایک ایسی عارضی تدبیر کے طور پر تجویز کی گئی ہے جس کا اصل مقصد پچھلی ناہمواریوں کو دُور کرنا ہے"۔ مودودی صاحب (مبادا کوئی بڑا زمیندار ناراض ہو جائے) فرماتے ہیں: "اسے مستقل بنانا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ مستقل تحدید اسلامی قانونِ وراثت اور متعدد دوسرے شرعی قوانین سے متصادم ہوتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا موقف پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے۔ اس سے کسی انحراف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" (آئین ۸ اپریل صفحہ ۱۸)

ایک سوال کے جواب میں کہ اس عارضی تحدید کی تجویز کی شریعت میں کہاں تک گنجائش ہے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اصلاحِ حال کے لیے ہے۔ جو ناہمواریاں زرعی املاک کے معاملے میں غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے پیدا ہو چکی ہیں اُن کو "ختم کرنے کے لیے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر

اصلاح اختیار کی جاسکتی ہیں جو اسلام کے اصُولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔"

مودودی صاحب کی اس تصریح سے ان کے "مذہبِ فکر" کے بارے میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں لیکن ہم صرف ایک ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جناب جو "غیر معمولی حالات" اور "ناہمواریاں" زرعی املاک کے بارے میں "غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے" پیدا ہوگئی ہیں کیا وہ پچھلے چھ مہینے میں آپ کو نظر آئی ہیں؟ کیا ان "غیر معمولی حالات یا ان "ناہمواریوں" اور اس "غلط نظام" کو آپ نے آج ملاحظہ فرمایا ہے؟ یا یہ پچھلے دوسو برس سے ہمارے معاشرے میں قائم ہیں؟ کیا یہ آپ کے الفاظ نہیں ہیں کہ:

"جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لیے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہوسکتی ہیں جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں — ایک گز مربع سے لے کر ہزارہا ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے تو بہرحال وہ اس کی جائز مِلک ہے .... رہیں نظامِ جاگیرداری کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اُڑا دی جائے یا اس پر مصنوعی حد بندیاں "زرعی اصلاحات" کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں۔"

(اسلام اور جدید معاشی نظریات - صفحہ ۱۲۷ - ۱۲۸)

اگر یہی بات ہے تو آپ ان "مصنوعی" حد بندیوں کی موافقت کر کے کیوں نیم حکیم کا لیبل لگوانے پر مُصِر ہیں؟

چلتے چلتے یہ بھی واضح ہو جائے کہ زرعی املاک کے معاملے میں "غلط قدم" آپ کس چیز کو کہہ رہے ہیں؟

ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ غیر معمولی تدابیر اصلاح — اور ظاہر ہے کہ زمین کی ملکیت کی تحدید کو آپ اسی رنگ میں دیکھتے ہیں — اسلام کے اصُولوں سے متصادم نہیں ہوتیں تو پھر ان کو مستقل طور پر اپنانے میں کیا امر مانع ہے؟ اگر تحدیدِ ملکیت اور ملکیت کا "قومیانہ" عارضی طور پر اسلام کے اصولوں سے متصادم نہیں ہوتا تو مستقل طور پر کیسے متصادم ہوسکتا ہے؟

بہرحال اے "حق گو" صاحب! بیان طویل ہو گیا ہے اس ہفتے کے لیے اجازت چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ اگر اگلے ہفتے تک "مُٹا" نہ دیا گیا تو مودودی صاحب کے معاشی نظریات کا تفصیلی جائزہ پیش خدمت کروں گا۔ ——— والسلام

میرزادہ

"ہٹلر و مسولینی پر اللہ کی رحمت ہو"

جماعت اسلامی کے بزرگ رہنما کا نیا فتویٰ

الحمد للہ کہ قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کو "ہٹلر اور مسولینی" قرار دینے والے جماعت اسلامی کے سربرآوردہ راہ نما، اور برگزیدہ صحافی جناب نصر اللہ خاں عزیز نے بائیس برس بعد اپنے ہفت روزہ "ایشیا" کے سرورق پر نہ صرف قائد اعظم کے افکار کو جگہ دی بلکہ اس "ہٹلر یا مسولینی" کو رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مستحق قرار دیا۔ یہ جماعت اسلامی کے اندر وہ انقلاب ہے جس کا یقین کرنا آسان بات نہیں مگر "وقت" وہ تلوار ہے جس نے نہ جانے کتنے جھوٹ اور فراڈ کاٹ کر رکھ دیئے ہیں ——— جماعت اسلامی کے راہ نما مولانا مودودی نے لندن سے واپسی کے بعد جب سے یہ اعلان کیا ہے کہ ——— "جب تک ہماری گردنوں پر سر سلامت ہیں یہاں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا نظام نہیں آسکتا" ——— جماعت اسلامی کا ہر چھوٹا بڑا سوشلزم یا اسلامی سوشلزم کے خلاف لٹھ لے کر بے مہار نکل پڑا ہے — مگر اس راہ میں انھیں مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی، علامہ اقبال رحمۃ اللہ کے علاوہ قائد اعظم رح کی کھڑی کی ہوئی دیوار سے بھی ٹکرانا پڑتا ہے ——— جماعت اسلامی نے آزادی سے پیشتر قائد اعظم سے ٹکر لی تو اُسے نہ صرف شکست کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ اُسے پناہ بھی ملی تو اس ملک میں جو قائد اعظم کا بنایا ہوا تھا ——— قائد اعظم کی رحلت کے بعد اب قائد اعظم کے اس ارشاد سے کہ "اسلامی سوشلزم میرے دل کا ترجمان ہے" جماعت اسلامی ٹکرانے کے لیے پر تول رہی ہے۔

سابق ہٹلر، مسولینی اور حال قائد اعظم محمد علی جناح رح کی ایک تقریر کا اقتباس ہفت روزہ ایشیا" (۴۔ اپریل) کے سرورق پر انگریزی اور اردو میں چھاپا گیا ہے ——— یہ تقریر قائد اعظم نے ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس (منعقدہ ؟) میں کی تھی۔ اقتباس یہ ہے۔

"کمیونسٹ ہمیں احمق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہ یہ رائے رکھنے میں کسی حد تک حق بجانب ہوں لیکن اب وہ غلطی پر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان پچھلے سات یا دس سال میں بہت بدل چکے ہیں اور اب کمیونسٹ ہمیں الّو بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے"۔

خبردار! خبردار!! میں کہتا ہوں اے کمیونسٹو خبردار ہو جاؤ اگر تم نے (ہمارے ساتھ) پھر وہی کھیل کھیلنے کی کوشش کی تو تمہاری بیہر چال خود تم پر الٹ دی جائے گی۔ ہم مسلم لیگ کے ستارہ و ہلال کے پرچم کے علاوہ کوئی اور پرچم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اسلام ہمارا راہ نما اور ہماری زندگی کا مکمل ضابطہ ہے، ہمیں کسی لال یا پیلے جھنڈے کی ضرورت نہیں ہے نہ ہمیں سوشلزم "کمیونزم"، نیشنل سوشلزم یا کسی دوسرے ازم کی ضرورت ہے؟

جب قائد اعظم کی اس للکار پر آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے متعلق برصغیر کے مسلمانوں کے موقف کو تسلیم کر لیا تو کمیونسٹوں کو اجازت دیدی گئی کہ وہ اگر تحریک پاکستان کی حمایت کرنا چاہتے ہیں تو آزاد ہیں —— اور کمیونسٹوں نے واقعی تحریک پاکستان کی حمایت اس لیے کی کہ یہ مطالبہ برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کا مطالبہ تھا —— مگر "ملحد کمیونسٹوں" کے مقابلے میں قائد اعظمؒ کو ہٹلر اور مسولینی اور "اسلامی ذہنیت سے عاری" قرار دینے والے مولانا نصر اللہ خاں عزیز افغان کے گورو مولانا مودودی نے اس وقت تک پاکستان کی مخالفت کی جب تک پاکستان قائم نہیں ہو گیا۔ —— تحریک پاکستان کی حمایت میں ملحد کمیونسٹ اچھے رہے یا یہ سامراجی ایجنٹ!

قائد اعظم کو بائیس برس بعد صحیح مقام دینے پر ہم مودودی جماعت کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ جب قائد اعظمؒ کے کئی پیروکاروں نے ۱۹۴۷ء میں تحریک آزادیٔ کشمیر کو جہاد قرار دے کر اپنی جان کی قربانی پیش کی تھی تو آپ نے اس نذرانہ شہادت کو "قتل" ایسے مکروہ لفظ سے یاد کیا تھا —— کیا آپ کو یاد ہے؟ اور یہ کہ آپ کی جماعت کی بھارتی شاخ آج بھی مسئلہ کشمیر پہ یا تو بھارتی حکومت کے موقف کے حامی ہے یا پھر اس مسئلہ پہ خاموش۔ مگر بھارت کا ملحد وہری پد ایسے کمیونسٹ راہ نما اور کمیونسٹ پریس بھارت کے موقف کی علی الاعلان مخالفت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "مسئلہ کشمیر" اب بھی باقی ہے اور وہاں کے عوام (جن کو مولانا مودودی صحیح مسلمان ماننے سے منکر ہیں۔ موجودہ مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوئم ص۱۶۲) کو اس مسئلے کو اپنی خواہشات کے مطابق حل کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔

۱۹۴۴ء میں کمیونسٹوں کے خلاف قائد اعظم نے جو کچھ کہا تھا وہ تحریکِ پاکستان" کی روشنی میں کہا تھا اور جب کمیونسٹوں نے قائد اعظم پر فرقہ پرستی کا الزام واپس لے لیا اور تحریک پاکستان کی مخالفت کی بجائے حمایت شروع کر دی تو قائد اعظم ان کے بارے میں بالکل خاموش ہو گئے —— مگر آپ؟ اور پھر قائد اعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں کہا تھا کہ "اسلامی سوشلزم میرے دل کا ترجمان ہے اور یہی پاکستان کا اقتصادی نظام ہوگا"

تو اس "اسلامی سوشلزم" کی مخالفت کون کر رہا ہے اور "اسلامی سوشلزم" کے لفظ کے استعمال پر قائد اعظمؒ ہی کے بارے میں تازہ ترین فتویٰ کس نے دیا ہے —— مولانا مودودی نے —— فرماتے ہیں۔

"جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ یا تو اسلام کو جانتے نہیں یا سوشلزم کو سمجھتے نہیں یا دونوں سے ناواقف ہیں اور یا پھر دھوکہ دیتے ہیں"

(ایشیا - ۴۔ اپریل ۶۹ء ص۴ کالم نمبر ۳)

جی ہاں آپ کے نزدیک قائد اعظم تحریک پاکستان کے دوران بھی مسلمانوں کو دھوکا دے رہے تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی "اسلامی سوشلزم" کا لفظ استعمال کر کے دھوکا دہی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ —— گویا نصر اللہ خاں عزیز کو اس "دھوکا باز" کے فرمودے کو اپنے موقف کی حمایت میں استعمال کرنے کا حق اس لیے ہے کہ آپ "اسلام میں جھوٹ کو جائز" قرار دیتے ہیں

(ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۲ء)

اسی جھوٹ کے جائز حق کو استعمال کرتے ہوئے عزیز صاحب نے ۱۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو مسٹر جناح کو "ہٹلر اور مسولینی" کہا تھا اور اسی حق کے تحت ۴، اپریل ۱۹۶۹ء کو انہیں "قائد اعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ" کہنے کی ضرورت پیش آئی —— اور اسی حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ قائد اعظم اسلام اور سوشلزم سے ناواقف تھے اور دھوکہ دیتے رہے تھے ——

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر، کھلا

اشتہار زیر آرڈر ۵ رول ۲۰ مجموعہ ضابطہ دیوانی
بعدالت جناب میاں محمد ارشد صاحب پی سی ایس گارڈین جج لاہور
بمقدمہ گارڈین شپ نمبر۔ بابت ۱۹۶۹ء
مساۃ زکیہ خاتون ۲۰ لیک روڈ لاہور سائلہ بنام عوام الناس ... مسئول علیہ / مسئول علیہم
درخواست برائے تقرری گارڈین ذات و جائداد نابالغان جاوید علی ہمدانی جائیداد واقع لاہور چھاؤنی و ضلع سانگھڑ مکی ڈھنڈ
اشتہار اخبار نوٹس بنام محمد الیاس .... ہرگاہ سائلہ نے بعنوانِ بالا درخواست عدالت ہذا میں دائر کی ہے لہٰذا آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی عذر نسبت درخواست ہو تو بتاریخ ۲۲/۴/۶۹ بوقت ۸ بجے صبح اصالتاً یا وکالتاً حاضر عدالت ہٰذا ہو کر پیش کریں بصورت دیگر کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔
دستخط حاکم
مہر عدالت

لے۔ چینگ۔ ٹُوئی

غیر ملکی امداد کے بغیر

چین نے کس طرح اقتصادی ترقی کی ہے

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کے لیے اقتصادی استحکام کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ غیر ملکی امداد کا سہارا لے کر معیشت کی گرتی ہوئی چھت کے نیچے ستون کھڑے کیے جائیں ـــ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ملکی ذرائع پر ـــ جن میں محنت کو سب سے اہم اور اولین مقام حاصل ہے ـــ تکیہ کیا جائے اور معیشت کی عمارت کو مضبوط اور صحت مند بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ سامراجی طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کو پہلا راستہ چننے پر آمادہ کریں تاکہ اقتصادی انحصار کے باعث وہ سیاسی طور پر بھی سامراجی طاقتوں سے منسلک رہیں اور چلانے کے لیے گولی اور کھانے کے لیے روٹی مانگنے کے رشتے سے سامراجیوں کے حاشیہ برداروں کا منصب پائیں۔ لیکن ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے حریت پسند عوام کو یہ راستہ قبول نہیں۔ ان کے سامنے انھی کی طرح کے ایک پسماندہ ملک چین کی مثال ہے جس نے اپنے ملکی ذرائع سے کام لے کر حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ آئیے اس مثال کو قریب سے دیکھیں ـــ

عوامی جمہوریہ چین اپنے قدموں پر ایک عظیم الشان طاقت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہُوا ہے۔ سولہ برس کے قلیل عرصے میں اس نے پرانے چین کے نقشے کو یکسر بدل دیا ہے۔ صنعت، زراعت، خبر رسانی، نقل و حمل اور دوسرے میدانوں میں اس کے کارناموں نے دوستوں کو ابھارا ہے اور دشمنوں کے دانت کھٹے کیے ہیں۔ یہ ساری ترقی ہوائی نہیں بلکہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے۔ چین کے مضبوط قدم آگے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔

خرچ کے لیے سرمایہ کہاں سے آتا ہے؟

تعمیر کے واسطے خرچ کرنے کے لیے سرمایہ ہونا چاہیئے۔ پرانا چین اپنی غریبی کے لیے مشہور تھا۔ تاہم نئے چین نے پچھلے دس برس سے کچھ زیادہ عرصے میں ایک بڑی رقم کو، کامیابی کے ساتھ جمع کر کے تعمیر پر لگایا ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے دوران میں (۵۷-۱۹۵۳ء) حکومت کی طرف سے معاشی اور معاشی تعمیر پر ہی ستر کروڑ ٹل سونے کی قیمت کے مساوی خرچ ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے۔

چین میں جدید صنعت و حرفت کے ادارے چنگ سلسلۂ سلاطین کے آخری دور اور بعد میں شمال کے جنگجو جاگیرداروں اور چیانگ کائی شیک کے دوران حکومت میں قائم ہو چکے تھے۔ متوسط طبقے کی ذاتی ملکیت جو شمال مشرقی چین میں جاپانی دورِ حکومت میں وجود میں آئی اس کو شامل کرتے ہوئے قومی اثاثے کی کل مالیت جو کہ اس ستر سال (۱۹۴۹ء ۸۰ ۱۸اء) میں جمع ہُوا، صرف بیس ارب یوآن تک پہنچی تھی۔ مگر پہلے پنج سالہ منصوبے ہی کے دوران میں چھیالیس ارب یوآن کا نیا اثاثہ مزید جمع کیا گیا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے (۱۹۶۲ء-۱۹۵۸ء) میں کل اثاثے کی مقدار میں اس سے بھی کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ کیسے ہُوا؟ غیر ملکی قرضے سے؟ جو قرضے نئے چین نے سوویٹ یونین سے لیے وہ اور ان پر جمع شدہ سود، کل ملا کر، صرف ایک ارب چالیس کروڑ ساٹھ لاکھ نئے روبل بنتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ یہ قرضے زیادہ تر جمہوریہ چین کے اوّلین دنوں میں لیے گئے تھے۔ اگر ۱۹۵۰ سے ۱۹۵۹ء تک مملکت چین کے کل مالیے کو ۱۰۰ مانا جائے تو اس کا صرف ۲ فی صد حصّہ غیر ملکی قرضے سے حاصل ہُوا تھا، یعنی مالیے کا ۹۸ فیصد حصّہ داخلی ذرائع سے حاصل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ قرضے جو کہ سوویٹ یونین سے ملے تھے بمع جمع شدہ سود کے ۱۹۶۵ء تک، وقت سے پہلے، چکا دیے گئے تھے۔ مزید برآں اس عرصے میں چین نے دوسرے اشتراکی اور دوست ممالک کو ایک بڑی مقدار میں، جو کہ اس کے اپنے غیر ملکی قرضے سے زیادہ ہے، سرمایے اور سامان کے ذریعے سے مدد دی ہے۔

خود اعتمادی کا راستہ

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں نے مشینوں کی صنعت جاری کرنے، زراعت کو جدید طرز پر لانے اور تعمیر کے واسطے سرمایہ جمع کرنے کے مسئلے

سے نمٹنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے ہیں۔

برطانیہ نے کئی عشروں بلکہ کئی صدیوں تک اپنی نوآبادیوں کی وحشیانہ لوٹ کھسوٹ پر انحصار کیا۔ مارکس کہتا ہے:

> "اگر ہم صرف اس جنس ہی کی قیمت کو پیش نظر رکھیں جو ہر سال ہندوستانیوں کو بلا استحقاق انگلستان بھیجنی ہوتی ہے...... تو یہ ہندوستان کے چھ کروڑ زرعی اور صنعتی مزدوروں کی مجموعی سالانہ آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔"

جرمنی زیادہ تر تاوانِ جنگ پر بھروسہ کیے رہا۔ فرانس کو ۱۸۷۰ء میں شکست دینے کے بعد اس نے ہارنے والوں سے پانچ ارب فرانک اینٹھ لیے۔ اس کے بعد چار سالوں میں جرمنی میں جو کارخانے بنے، جو کانیں کھودی گئیں اور جو ریل کی پٹریاں بچھائی گئیں اُن کی مقدار اس تعمیری کام سے کہیں زیادہ ہے جو عام حالات میں ۲۵ برس کے عرصے میں انجام پاتا۔

زاروں کے رُوس نے زیادہ تر غلامانہ قرضوں پر تکیہ کیا جس کے نتیجے میں باقاعدہ طور پر اپنے آپ کو غیرملکی سرمایے کا محتاج بنالیا۔

کئی دوسرے سرمایہ دار ممالک نے یہ تینوں طریقے، ایک ساتھ استعمال کیے۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ نے اپنے سُرخ فام باشندوں کی بے دردی سے خون ریزی کی، غلاموں کی تجارت میں حصہ لیا۔ اپنے نوآبادیاتی مفادات کو فروغ فروغ دیا اور دوسرے ممالک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔

نیا چین سرمایہ دار ممالک کے طریقے کبھی اختیار نہ کرسکتا تھا۔ لُوٹ کھسوٹ، استحصالِ بالجبر، نفع اندوزی اور دُوسروں کا مال اُڑا کر انہیں کنگال کرنا اشتراکی چین کی نظریاتی بنیادوں سے اتنا ہی متضاد ہے جتنا آگ سے پانی۔

تو پھر کیا راستہ اختیار کیا گیا؟ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ چین کی ترقی غیرملکی سرمایے کی مدد سے ہونی چاہیئے۔ مگر تاریخ نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ غیرملکی روپے پر بھروسا تعمیر کی رفتار کو تیز کرنے کی بجائے نوآبادیاتی کھڈ کی طرف ہی دھکیل سکتا ہے۔ یہ راہ اختیار نہ کی جاسکتی تھی۔

جو راستہ چین نے اختیار کیا وہ صدر ماؤزے تنگ کا تراشا ہوا خوداعتمادی کا راستہ تھا۔

تین انکشاف انگیز اعداد و شمار

کیا چین جیسا غریب ملک اپنی ذاتی کوششوں پر بھروسا کرسکتا ہے؟ کیا اس کے پاس، تعمیر کے واسطے سرمایے کی فراہمی کے داخلی ذرائع ہیں؟

جواب ہے، ہاں۔ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ چین میں قومی جمہوری انقلاب سرانجام پاچکا ہے اور ساتھ ہی پیداوار کے وسیلوں کی ملکیت اشتراکی بنیادوں پر استوار ہوچکی ہے۔

اس دوہرے انقلاب کے نتیجے میں چین میں سامراجی حکومت کو جڑوں سے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ وہ دولت جو پہلے سامراجی لے جاتے تھے وہ اب تعمیر میں لگائی جاسکتی ہے۔

جاگیرداری نظام کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ اُس دولت کا، جو جاگیردار اپنی مسرفانہ زندگی کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بے دردی سے تصرف میں لاتے تھے، ایک حصہ اب تعمیری کام میں خرچ ہوسکتا ہے اور ایک بڑا حصہ کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے پس انداز کیا جاسکتا ہے۔

افسرشاہی کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ وہ قومی دولت جو کہ افسرشاہی کے مہرے اپنے عیش و عشرت کے واسطے ہتھیا لیتے تھے وہ بھی اب تعمیر کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔

سرمایہ دارانہ صنعت و حرفت اور تجارت کی اشتراکی بنیادوں پر کایا پلٹ ہوچکی ہے۔ سرمایہ دارانہ کاروبار کے مشترک ریاستی و ذاتی کاروبار میں تبدیل ہونے کے بعد اس کاروبار کا منافع زیادہ تر قومی تعمیر پر خرچ ہوتا ہے اور صرف ایک قلیل رقم سرمایہ داروں کو اُن کے حصّوں پر "غیرمنقولہ شرح سوُد" کی صورت میں ملتی ہے۔

مختصراً، چین کے پاس تعمیر کے واسطے اب اپنا روپیہ بھی ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ اسی روپے کا ایک بڑا حصہ پہلے سامراجیوں، جاگیرداروں، افسرشاہی کے مہروں اور سرمایہ داروں کی جیب میں جاتا تھا۔ چینی انقلاب کی فتح نے اصلی مالکوں ــ عوام ــ کو اس قابل بنادیا ہے کہ وہ اپنی دولت کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ محنت کش طبقہ اپنے ملک کی تعمیر اب اُس دولت سے کر رہا ہے جو اس نے خود پیدا کی ہے۔

اس بات کو اور صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیے ہم جدید چین کی تاریخ میں نظر آنیوالے ان تین اعداد و شمار پر غور کرتے ہیں: ۴۵ کروڑ ٹل چاندی، ۵۰ کروڑ ٹل سونا اور ۷۰ ارب ٹن گندم

۴۵ کروڑ ٹل چاندی وہ تاوانِ جنگ تھا جو چین پر آٹھ حکومتوں کی اتحادی فوج نے ۱۹۰۱ء میں لشکرکشی کے بعد عاید کیا۔ ایسے کئی تاوانِ جنگ اور بھی تھے۔ اس کے علاوہ مالِ تجارت کی ذخیرہ اندوزی کرتے، سرمایہ برآمد کرتے، غیرمساوی شرح محصول اور سمگلنگ کے ذریعے سے سامراجیوں نے ملک کی بیشتر دولت اپنے قبضے میں کر رکھی تھی۔

۵۰ کروڑ ٹل سونا وہ دولت تھی جو چیانگ کائی شیک کے وقتوں کے چار بڑے خاندانوں: ٹی، وی سونگ، ایچ۔ ایچ کونگ اور چینگ برادران نے کومن ٹانگ کے ۲۲ سالہ دورِ حکومت میں بٹوری۔

۷۰ ارب ٹن گندم وہ لگان تھا جو اصلاح اراضی سے پہلے چینی کسان ہر سال جاگیرداروں کو ادا کرتے تھے۔ اس بے حد زیادہ لگان کی وجہ سے کسان اپنی پیداوار بڑھانے سے لاچار تھے۔ کسان کے لیے یہ بھی محال تھا کہ وہ اپنے کھیتوں میں بیج ڈال سکیں یا رُوکھی سوکھی کھا کر ہی زندگی بسر کرسکیں۔

ان تین اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دولت جو کچھ کم نہ تھی جو اپنے ملک کے مختار ہونے کے بعد محنتی اور بہادر چینی عوام قومی تعمیر کے لیے استعمال میں لا سکتے تھے۔

معیشت کی نشوونما اور رسد کی حفاظت

مگر اس دولت کے استعمال کا امکان جو سامراجی اور نفع خور طبقے اُڑا لے جاتے تھے اس تصویر کا صرف ایک رُخ ہے۔ اس سے زیادہ ضروری یہ دُوسرا پہلو ہے کہ جب محنتی عوام کی کثیر تعداد نفع خوری اور ظلم سے پیچھا چھڑا کر اُونچے درجے کے سیاسی شعور سے مسلح ہوتی ہے تو وہ اپنی جودت طبع اور خلاقی کا پوری طرح سے استعمال کر سکتی ہے۔ اشتراکی تعمیر کے مروجہ نعرے کے الفاظ دیکھیے: "جان کی بازی لگا دو اور نگاہیں بلند رکھو" تاکہ قومی معیشت ترقی کرے اور جلد از جلد بہتر نتائج برآمد ہوں۔ اشتراکی نظام کے اجتماعی فوائد کے تحت اپنی صلاحیت اور حکمت کو استعمال میں لانے کے بعد عوام اپنی پیداکارانہ طاقتوں کو پرانے معاشرے کی طاقتوں سے دس گنا ہی نہیں بلکہ سو گنا زیادہ کر سکتے ہیں اور اس طرح قومی معیشت کی نشوونما کو ایک مسلسل ہانکا دے سکتے ہیں۔ معیشت کی نشوونما اور پیداوار میں اضافہ اور گردش زیادہ مالی وسائل پیدا کرتے ہیں۔

انقلابی جنگ کے دوران ہی میں صدر ماؤزے تنگ نے کہا تھا:

"معیشت کی نشوونما اور رسد کی حفاظت ہی ہماری معاشی اور مالی حکمت عملی کے رہبر ہیں۔" انہوں نے یہ بھی کہا: "اگرچہ ایک اچھا یا بُرا مالی نظام معیشت پر اثر انداز ہوتا ہے مگر معیشت ہی مال کا تحفظ کرتی ہے۔"

انقلابی جنگوں کی تاریخ اور آج کی اشتراکی تعمیر کی واقعیت اس حکمتِ عملی کے صحیح ہونے کی یکساں ضامن ہیں۔

مثال کے طور پر ہمارے پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں اوسط سالانہ ترقی کا نقشہ یہ تھا: اٹھارہ فی صد صنعتی پیداوار پر، ۴ء۵ فی صد زراعت پر اور ۱۲ء۱ فیصد مالیے پر (صنعتی و زرعی ترقی کی رفتار کے مابین) منصوبہ شروع ہونے سے پہلے مالیہ ۱۷۔ارب ۵۰ کروڑ یوآں تک پہنچا تھا اور منصوبے کے آخری سال (۱۹۵۷ء) تک یہ ۳۱۔ارب یوآں تک ہو گیا تھا۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں چین کی دولت کے نظم و نسق کو تین سال متواتر قدرتی حادثات اور خروشیف کے عہد میں سوویٹ ماہرین کو واپس لے لینے اور کئی سو چینی رُوسی معاہدوں اور اقرار ناموں کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینے سے وقتی طور پر مشکلات کا سامنا ہُوا۔ ان مشکلات کا اثر حکومت کے مجموعی سرمایے کی مقدار پر پڑا مگر پارٹی کے "طرز عمل" دوبارہ تربیت، مستعدی، استحکام، اور بلند نظری اور کئی دیگر تدبیروں کے متواتر سلسلوں کی مکمل تعمیل سے قومی اجتماعی وسائل نے جلد ہی پوری طرح سے بہتری کی طرف رُخ موڑ لیا۔ قومی ذخیروں کی مقدار میں بھی اسی کے مطابق اضافہ ہُوا۔

معیشت کی نشوونما کا یہ مقصد نہیں کہ کسی بھی طرح کی معیشت کی ترقی بلکہ اشتراکی معیشت۔ عوامی جمہوریہ کے اوّلین دور میں چین کی معیشت پانچ حصوں پر مشتمل تھی۔ یعنی ریاستی ملکیت کی معیشت، امداد باہمی کی معیشت، کسانوں اور دستکاروں کی انفرادی معیشت، ریاستی سرمایہ دارانہ معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت، ۱۹۵۰ء میں ریاستی مالیے کا ۳۴ء۱ فیصد حکومت کے ذاتی کاروبار اور امداد باہمی کی انجمنوں سے ملا۔ ۲۹ء۶ فیصد انفرادی کسانوں سے اور ۳۲ء۹ فی صد سرمایہ دارانہ صنعت و حرفت اور بیوپار سے۔

ہماری زراعت، صنعت، دست کاری اور بیوپار کی اشتراکی کایا پلٹ (جہاں تک کہ پیداوار کے ذرائع کی ملکیت کا تعلق ہے) بڑی حد تک ۱۹۵۶ء میں ہو چکی تھی۔ اس وقت چین کی معیشت خاص طور پر اشتراکی ریاست ملکیت کی معیشت اور اشتراکی اجتماعی معیشت پر مشتمل تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں ۹۱ء۸ فی صد ریاستی مالیہ ریاستی ملکیت کی معیشت سے وصول ہُوا، ۷ء۴ فی صد عوامی کمیونوں اور دیگر اجتماعی شعبوں سے اور ایک فی صد سے بھی کم بچی کھچی سرمایہ دارانہ اور زمیندارانہ معیشت سے۔ اس سے ظاہر ہُوا کہ چین کا تقریباً سارا مالیہ اس کے اشتراکی دائرہ معیشت ہی سے وصول ہوتا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس آمدنی کا ۹۰ فیصد حصہ خود حکومت کے شعبوں سے وصول ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وہ بنیاد کس قدر مضبوط ہے جس پر چین کے مالیے کی بنا رکھی گئی ہے۔

جاں فشانی اور کفایت کے ساتھ ملک کی تعمیر

صدر ماؤزے تنگ نے کہا تھا: "کارخانے، دُکانیں، ریاستی ملکیت و امداد باہمی کے ادارے اور باقی ہر طرح کے کام جاں فشانی و کفایت شعاری کی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے پروان چڑھیں۔ اشتراکی معیشت کا یہ بنیادی طریق عمل ہے۔" اپنی ابتداء ہی سے چین نے اس بات کی اہمیت پر زور دیا کہ تمام کام کاج جان فشانی اور کفایت شعاری کے ساتھ ہی ہوں تاکہ قومی تعمیر کے واسطے اپنے ذرائع سے سرمایہ جمع کیا جا سکے۔ رقم جمع کرنے کے لیے ہم اپنی کوششوں پر اس لیے بھروسا کر سکتے ہیں کہ چینی عوام کی بے انتہا طاقت اور ہر کام میں اُن کی محنت اور کفایت شعاری کی عادت ہماری بہت مدد کرتی ہے۔

پچھلے چند سالوں میں ہر تعمیری محاذ پر ایسی کئی جماعتیں ظہور میں آئی ہیں جن کی نمایاں صفات جاں فشانی، کفایت شعاری اور ان تھک جدوجہد ہیں۔

زرعی محاذ پر شانسی صوبے کی ٹاچائی پیداواری بریگیڈ عرصے سے خود اعتمادی اور جدوجہد کی بہت اچھی مثال ہے۔ آج اس وضع کی پیداکار بریگیڈیں سارے ملک میں موجود ہیں۔ شانٹونگ صوبے کے ضلع ہوآنگ ڈین کی زیاڈنگ ژیا بریگیڈ اس وضع کی بہت عمدہ کاشتکار جماعت ہے۔ یہ بریگیڈ اُن بنجر علاقوں میں کام کرتی ہے جو جزیرہ نما چیاؤ ٹونگ کے شمالی پہاڑوں میں ہیں۔ اس کے پاس کوئی ۲۴۰۰ مو زیر کاشت زمین ہے۔ جس کا کوئی ۸۰ فی صد پہاڑی ڈھلانوں پر پھیلا ہُوا ہے۔ اکثر جگہ پر کاشت کے قابل مٹی کی سطح ۳ سے ۴ انچ تک گہری تھی۔ بارش کے دنوں میں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر، پانی سب کچھ بہا لے جاتا تھا اور خشک موسموں میں سوتے سوکھ جاتے تھے۔

۱۹۵۸ء میں عوامی کمیون قائم ہونے کے بعد زیاڈنگ ژیا بریگیڈ نے اپنے کام میں بنیادی تبدیلی کرنی شروع کی۔ اپنے وسائل یعنی محنت مزدوری کی صلاحیت، سامان اور سرمایے کا استعمال کرتے ہوئے اُنہوں نے پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے بندشیں باندھیں، نہریں اور

نالے کھودے، پمپنگ گھر تعمیر کیے اور دریا سے پہاڑ تک آبپاشی کا ایک نظام قائم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے اپنے کھیتوں کو ہموار کرنے اور پہاڑوں کی ڈھلانوں پر درخت اگانے کا کام ایک بڑے پیمانے پر شروع کیا اور ۱۶۰۰ مو سے زیادہ زرعی زمین کی اوپری تہہ کو تقریباً ایک گز گہرا کر دیا۔ اُنہوں نے پہاڑوں کی ڈھلانوں پر پھل دار درختوں کے باغ بھی لگائے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے دنوں میں یہ لوگ ہر مو سے کوئی دو سو ڈن گندم حاصل کرتے تھے۔ کئی سال کی لگاتار محنت کے صلے میں ۱۹۶۴ء تک ہر مو سے اوسطاً ۹۲۰ ڈن گندم حاصل ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی جنگلاتی پیداوار، حیوانی نسل کشی اور دیگر متعلقہ شعبوں میں بھی ترقی ہوئی۔

صنعت وحرفت کے محاذ پر ٹاچنگ میں واقع تیل کا کنواں ایک بڑے پیمانے کا، خود اعتمادی اور محنت کی بنا پر قائم ہونے والا، مثالی کام ہے۔ جب کنواں کھودنے والے یہاں پہنچے تو یہ ایک نہایت اجاڑ علاقہ تھا۔ منصوبے کے اولین دنوں میں کاریگر لوگ خیموں میں سوئے اور جاڑے گزارنے کے لیے جھونپڑیاں بھی انہوں نے خود ہی بنائیں۔ باربردار مشینوں کے دیر سے پہنچنے پر اُنہوں نے، وقت بچانے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں سوراخ کرنے والی لحیم شحیم مشینوں کو دھکیل دھکال کر خود ہی ریل گاڑی سے اتار لیا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کی وجہ سے اس منصوبے کا کام نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پورا ہُوا۔ ایک برس سے ذرا زیادہ کے عرصے میں تہ نشیں مادے کا مکمل جائزہ لے لیا گیا اور تین برس کے قلیل عرصے میں تیل کا ایک بڑا اور جدید کارخانہ قائم ہو گیا۔

کانسو صوبے کے علاقے لانچو میں واقع تیل صاف کرنے کا کارخانہ ایک اور کارِ عظیم ہے جس کے پیچھے جان فشانی، کفایت شعاری اور محنت کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں جب سے یہ قائم ہُوا ہے، ہر سال اس کارخانے نے توقعات سے بڑھ چڑھ کر کام کیا ہے۔ سال بہ سال اس کی پیداوار بڑھتی ہی گئی اور مصنوعات کی اقسام میں پانچ گنا اضافہ ہو گیا۔ مزید برآں، ابتدائی منصوبے کے مطابق اس کی مصنوعات اعلیٰ معیار کی ہیں اور ہر سال ان کا خرچہ بھی کم ہوتا گیا ہے۔ تیل صاف کرنے کے اس کارخانے نے ہمیشہ سے اپنی مالیات کا کڑا معیار قائم کر رکھا ہے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک اس کارخانے نے، حکومت کے واسطے، اس رقم سے جو کہ حکومت نے اس کی تعمیر پر خرچ کی تھی، ۶ کروڑ یوآن اور زیادہ جمع کر دکھایا۔

چین نسبتاً غریب ہے؛ بظاہر یہ ایک بالکل ہی ناموافق صورتِ حال معلوم ہوتی ہے۔ مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس بات کا فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ غریب لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں ایک ولولہ ہوتا ہے اور حالات میں تغیّر لانے کے لیے وہ جان لگا کر محنت کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ تن دہی، کفایت شعاری اور جدوجہد کے اس جذبے کو بروئے عمل لا کر چینی عوام اپنے ملک کی معیشت کو ترقی دے رہے ہیں اور تعمیر کے لیے رقم اکٹھی کر رہے ہیں۔

ریاست کے پاس سرمایے کا اجتماع

مزدوروں اور کسانوں کی کثیر تعداد اپنی پیداوار کے ذریعے سے رقم اکٹھی کرتی ہے مگر یہ رقم ان کے متعدد بیوپاروں اور عوامی کمیونوں میں بٹی ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کے ہاتھوں میں اس تمام سرمایے کا موزوں طریقے سے اجتماع ہو تاکہ ریاست اس کا استعمال یکساں روی اور نظم کے ساتھ کر سکے۔

یہ دو خاص طریقوں سے ہوتا ہے:

۱: ہر ریاستی پراجیکٹ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اپنا نفع حکومت کو ایک مقررہ وقت پر پہنچا دے۔

۲: کئی طرح کے محصول عاید کیے جاتے ہیں۔ خاص خاص محصولات مندرجہ ذیل ہیں: تجارت اور صنعت وحرفت کا مجتمع محصول، صنعتی وتجارتی آمدنی کا محصول، نمک کا محصول، محصول درآمد، زرعی محصول اور حیوانی نسل کشی کا محصول وغیرہ۔ زرعی اور حیوانی نسل کشی کے محصول کے علاوہ جو کہ عوامی کمیونوں کی پیداواری جماعتیں اور بریگیڈیں ادا کرتی ہیں، باقی محصول کا زیادہ حصہ ریاستی پراجیکٹوں سے ملتا ہے۔ نئے چین میں ذاتی آمدنی پر کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا۔

پچھلے سالوں کے مختلف اوقات میں مندرجہ بالا طریقے سے جمع کیے ہوئے سرمایے کی شرح بدلتی رہی ہے۔

۱۹۵۰ء میں ریاستی کاموں کا منافع ریاستی مالیے کا ۱۳ء۳ فی صد تھا، صنعتی اور تجارتی محصول ۲۹ فی صد اور زرعی محصول ۱۶ء۱ فیصد تھا۔

یہ تبدیلی اشتراکی معیشت کی ترقی کو منعکس کرتی اور ریاست کی اُس حکمت عملی کی توضیح کرتی ہے جس کے ذریعے سے کئی برس سے، کسانوں کے محصول کے بوجھ کو مسلسل کم اور ہموار کیا گیا ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت کسان جو زرعی محصول ریاست کو ادا کرے گا اس میں ایک خاص مدت تک کوئی اُونچ نیچ نہ آئے گی۔ اُن کسانوں کا، جن کی فصل کسی قدرتی حادثے کی وجہ سے خراب ہوئی ہو، محصول یا تو کم کر دیا جائے گا یا بالکل معاف؛ مگر بہتر پیداوار پر محصول بڑھایا نہیں جاتا۔ زیادہ پیداوار کسانوں ہی کے پاس رہتی ہے جس کے استعمال سے وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں اور اپنے کمیونوں کی بریگیڈوں اور جماعتوں کے ذخیرے کو فروغ دے سکتے ہیں۔

چین میں اس بات کی ثابت قدمی سے مخالفت کی جاتی ہے کہ ریاستی بیوپار صرف نفع حاصل کرنے کے واسطے ہی ہو کیونکہ یہ راستہ رجعت پسندانہ ہے اور سرمایہ داری کی جانب لے جاتا ہے۔ سٹہ بازی اور قیمت بڑھا کر نفع خوری جیسے غیر قانونی ذریعے استعمال کرنے کی بھی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ تاہم ہر ریاستی ادارے کے لیے لازم ہے کہ وہ، ریاستی منصوبے کی تکمیل کرتے ہوئے، مستعدی کے ساتھ اپنی مالیات کو بہتر بنائے، پیداوار بڑھائے، خرچے میں کمی کرے، اور اتنا منافع کما لے جتنا کہ ریاست نے اس کے ذمے ڈالا ہو، تاکہ وہ ریاست کو تعمیرِ نو کے واسطے سرمایہ مہیا کر سکے۔

مندرجہ بالا خاص خاص طریقوں کے علاوہ ریاست، اپنے بینکوں کے ذریعے سے، ایک پراجیکٹ کے عارضی طور پر کام نہ آنے والے سرمایے کو اپنی تحویل میں لے کر دوسرے پراجیکٹ کو ادھار دیتی ہے تاکہ وہ اس کو ایک امدادی سرمایے کے طور پر استعمال میں لا سکے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی مرضی سے "بینک میں روپیہ جمع کرانے اور بینک سے روپیہ نکلوانے کی آزادی کے بنیادی اصولوں کی مطابقت میں ریاست

عوام کی پس انداز کی ہوئی رقموں کو اپنی تحویل میں لے کر استعمال میں لاتی ہے تاکہ زر گردش میں رہے اور ریاست کی مالی حالت بہتر ہوتی چلی جائے۔ بچت اس بات کی بھی ترغیب ہے کہ عوام کو "اپنا گھر بار محنت و کفایت شعاری" سے چلانے کی عادت پڑے۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ، کم خرچ سے زیادہ کام چلاؤ

مسئلہ صرف اس حد تک ہی نہیں کہ ترقی کے لیے سرمایہ کس طرح جمع کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس سرمایے کا معقول استعمال کیونکر ہو۔

سرمایہ اکٹھا کرنے کے امکانات اور تعمیر کی ضروریات، دستیاب مالیے اور ریاستی مطالبات میں ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ اس تضاد کے سلسلے میں چینی طریق عمل یہ ہے: "چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ، کم خرچ سے زیادہ کام چلاؤ۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا مقصد ہے کہ ہم اپنے حالات کا اچھی طرح سے جائزہ لیں اور اپنی طاقت اور وسائل کا تخمینہ باحتیاط لگائیں۔ کم خرچ سے زیادہ کام چلانے کے معنی ہیں کہ ہم اپنی اختراعیت کو کام میں لائیں اور خوب محنت کریں۔ اگر ہم خیالی پلاؤ پکاتے رہے اور اپنی دولت اور اہم وسائل کو گنجائش سے زیادہ کام میں لانے پر زور دیتے رہے تو اس جلدبازی کا نتیجہ رفتار میں کمی ہوگا۔ دوسری طرف اگر ہم اُن کاموں سے، جو کہ مستعدی سے پورے ہو سکتے ہیں، احتراز کرتے رہے تو تعمیر کا کام سُست پڑ جائے گا۔

عوامی چین کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ میزانیے کا توازن تھوڑی سی بچت کے ساتھ برقرار رہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرنے اور کم دولت سے زیادہ کام نکالنے کی حکمت عملی کے نتیجے میں وہ مالیاتی خسارے جنہوں نے پرانے چین اور دوسرے سرمایہ دار ممالک کو لپیٹ میں لیا ہوا تھا، نئے چین میں عرصۂ دراز سے غائب ہو چکے ہیں۔

ریاستی مصارف کو متعین کرنے کی پالیسی پر عمل درآمد کرنے کا مطلب ہے کہ اپنے تصرف میں لائے ہوئے سرمایے کا ایک بڑا حصہ اقتصادی اور ثقافتی تعمیر میں لگایا جائے اور ریاست کے انتظامی اخراجات میں کمی کی جائے۔ مثال کے طور پر پہلے پنج سالہ منصوبے کو لیں: کل خرچ کا ۴۹ء۵ فیصد اقتصادی تعمیر پر، ۱۴ء۵ فیصد ثقافت تعلیم، صحت عامہ اور معاشرتی بہبود پر، ۲۲ء۳ فی صد ملکی دفاع پر، اور ۸ء۶ فی صد نظم و نسق پر خرچ ہوا۔

صنعت و حرفت کی انتظامیہ اور مصنوعات کی ساخت میں انقلاب لانے کے لیے، ۱۹۶۴ء کے موسم سرما سے، چین نے بڑے پیمانے پر تحریکیں شروع کی ہیں۔ ان تحریکوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ کم خرچ سے زیادہ کام چلانے کے نصب العین کو پورا کیا جائے۔ صنعت و حرفت کی انتظامیہ کی کایا پلٹ کا مقصد، خاص طور پر، یہ ہے کہ انتظام کے طریقوں کو سدھارا جائے، نظم و نسق کے ڈھانچوں کو ہموار اور رواں کیا جائے، غیر پیداکار عملے کی کٹوتی کی جائے، ایسے مستقل عملے کی بھرتی کی جائے۔ جو پیداکار محنت کا حصہ بن سکے تاکہ وہ قوم کے قائدانہ اور عملی شعبوں کو اس قابل بنائے کہ مزدوروں اور کارکنوں کی حالت بہتر ہو سکے۔ یہ عملہ پیداکار محنت کشوں کا ہاتھ بٹانے کے علاوہ خود بھی پیداوار بڑھائے اور عوام کے ساتھ رابطہ پیدا کرے اور ان کی امداد حاصل کر کے کام کی انجام دہی کرے۔ اس سے کام کے غیر پیداکار اخراجات میں کمی واقع ہوگی، افسر شاہی قابو میں آئے گی، مستعدی بڑھے گی، رہنماؤں اور عوام کی یک جہتی کو تقویت پہنچے گی اور اس طرح، یکساں روی کے ساتھ، مختلف پراجیکٹ اشتراکی اصولوں پر ترقی کرتے رہیں گے۔

ساخت کے میدان میں نئی نئی اختراعات کرنے کے سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ اختراع گر اپنے دفتروں سے باہر نکل کر محنت کش طبقے سے گھلیں ملیں اور اپنا مطالعہ اور تحقیقات ان مقامات پر ہی کریں جہاں تعمیر ہونے والی ہو اور اپنے ڈیزائنوں میں مستقل عملے، ماہرین خصوصی اور عوام کی کوششوں کی عمل آرائی کے لیے گنجائش رکھیں۔ اس طرح کام کرنے سے اختراع گر، چین کے اصلی حالات کے مطابق اختراعات کر سکیں گے۔ وہ اپنے آپ کو دقیانوسی خیالات یا نامناسب غیر ملکی رسموں اور فارمولوں سے نجات دلا سکتے ہیں، اپنی پیشہ ورانہ معلومات اور ہُنر کا کہیں بہتر استعمال کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام کے قیمتی تجربے کو بھی استعمال میں لا سکتے ہیں۔ بہتر ڈیزائنوں کے علاوہ اس طرح خرچ میں کفایت بھی ہوتی ہے۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے اور کم خرچ سے زیادہ کام چلانے کی پالیسی کے اطلاق سے یہ ممکن ہے کہ محدود سرمایے سے نسبتاً زیادہ اقتصادی تعمیر کی جائے۔ کفایت شعاری مالیات کی جڑ ہے۔ جیسے جیسے کفایت شعاری بڑھتی ہے زیادہ سرمایہ جمع ہوتا ہے اور سرمایے کی اس بڑھوتری کو استعمال میں لا کر معیشت کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

عوام کی بہبود اور تعمیری کام شانہ بہ شانہ پنپتے ہیں

ایک غیر ملکی نے ایک دفعہ کہا تھا: "چین کی اقتصادی ترقی واقعی حیرت انگیز ہے، یہ اُس معجزے کی طرح ہے جس میں ایک پہاڑ راتوں رات بن جاتا ہے۔ چین میں تعمیر کا پہاڑ تو موجود ہے مگر اس کے اردگرد ایک بڑا قطعۂ زمین کھدائی کی وجہ سے گہرا ہو گیا ہے۔" اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ تعمیر تو واقعی نہایت تیزی کے ساتھ جاری ہے مگر اس سے عوام کے وسائل ختم ہو رہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ نہیں یہ بالکل غلط ہے؟

نئے چین میں، قومی آمدنی کی تقسیم کے وقت، ریاست کے جماعتی اور انفرادی مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ۱۹۵۴ء میں، قومی آمدنی کا ۷۸ء۴ فیصد حصہ صرف کیا گیا جس کے مقابلے میں ۲۱ء۶ فی صد پس انداز ہوا۔ اس سلسلے میں ۱۹۵۵ء کے اعداد و شمار ۷۹ء۵ فیصد صرف کے مقابلے میں ۲۰ء۵ فی صد سرمایہ کاری اور ۱۹۵۶ء میں یہ ۷۷ء۲ فی صد صَرف کے مقابلے میں ۲۲ء۸ فی صد سرمایہ کاری تھے۔

یہ صحیح ہے کہ چینیوں کے رہن سہن کا معیار ابھی کوئی زیادہ بلند نہیں ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کے پاس کھانے اور پہننے کے لیے کافی ہے۔ آج چین میں

بے روزگاری اور بھوک ناپید ہیں۔ اس انتہائی مفلسی کے مقابلے میں، جس سے چینی عوام آزادی سے پہلے دوچار تھے، یہ ایک نمایاں کامیابی ہے (اب چین میں محض چند لوگ ترقی نہیں کرتے، سب کے سب ترقی کرتے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ چند ایک کے پاس کروڑوں روپے ہوں اور کروڑوں کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو)۔

پھر بھی پچھلے ۱۶ برس کے دوران میں چینیوں کے رہنے سہنے کا معیار سال بسال بہتر ہی ہوتا ہے۔ اقتصادی بحالی کے دنوں میں (۵۲-۱۹۵۰ء) مزدوروں کی تنخواہ اوسطاً ۷۰ فی صد بڑھی اور پھر پنجسالہ منصوبے کے دوران میں یہ ۴۲۶۸ فی صد مزید بڑھ گئی۔ تنخواہ میں اس اضافے کے علاوہ ریاست نے مزدوروں اور دوسرے محنت کشوں کے بیموں اور مکانات وغیرہ تعمیر کرنے کے منصوبوں کے سلسلے میں ایک بہت بڑی رقم مختص کی ہے۔

کسانوں کی آمدنی بھی باقاعدگی کے ساتھ بڑھی ہے۔ اقتصادی بحالی کے دنوں میں یہ ۳۰ فیصد سے زیادہ بڑھی اور پھر پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ۳۰ فیصد مزید بڑھ گئی۔

چین کی ملکی منڈیوں پر ایک نگاہ ڈالنے سے بھی یہ بات ثابت ہوجاتی ہے۔ آج منڈیوں میں جنس نسبتاً افراط کے ساتھ موجود ہے اور ہر طرف خوشحالی دکھائی دیتی ہے۔ گوشت، ترکاریاں اور اسی قماش کی دوسری کھانے پینے کی چیزیں ۱۹۶۴ء میں ۱۹۵۷ء سے ۳۰ فیصد زیادہ تھیں۔ اسی دوران میں مشین سے بنا ہوا کاغذ، ایلومینیم کے برتن، چینی کے برتن، بائیسکلیں، ریڈیو اور روزمرہ استعمال کی دوسری ضروری اشیاء کی مقدار ۵۰ فیصد بڑھ گئی۔

اس کے ساتھ ساتھ چین میں چیزوں کی قیمتیں عرصے سے مستحکم رہی ہیں۔ گندم سوتی کپڑے سے بنی ہوئی اشیاء، کوئلہ اور دیگر روزمرہ استعمال میں آنے والی اشیاء کی قیمت یکساں ہونے کے علاوہ کم بھی ہے۔ اب چینی عوام کو قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

نئے چین کے سکۂ رائج الوقت، رن من بی کی قدر مستحکم ہے اور یہ دیس اور پردیس دونوں میں اچھی شہرت رکھتا ہے۔ کومنٹانگ کی رجعت پسندانہ حکومت کے دوران میں جو مسلسل افراطِ زر تھی چینی جمہوریہ کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کا قلع قمع کردیا گیا تھا۔

یہ صورت حال اپنا آئینہ آپ ہے۔ نئے چین کی عوامی حکومت نے نہیں، بلکہ پرانے چین کے شہنشاہیت پسند، جاگیردار اور افسرشاہی سرمایہ دار حکمرانوں نے تعمیر کا پہاڑ کھڑا کیے بغیر اردگرد کی زمین کھود کر عوام کی قوتوں کو سلب کیا تھا۔

قومی تعمیر کے ضمن میں جو کچھ چین نے حاصل کیا ہے وہ شروعات کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں ابھی کئی کوتاہیوں اور مشکلات پر غالب آنا ہے۔ ہمیں منکسر اور محتاط ہونا چاہیئے اور اپنے آپ کو گھمنڈ اور جلد بازی سے بچانا چاہیئے۔ چینی اشتراکی پارٹی اور صدر ماؤزے تنگ کی قیادت میں ہمیں چاہیئے کہ اس سے بھی زیادہ محنت سے کام کریں۔ اور جور و جبر میں دبے ہوئے دنیا بھر کے لوگوں کو ان کی جدوجہد میں مدد دیں۔ یہ ہمارا فرض عظیم ہے۔ جیساکہ صدر ماؤ نے پچھلے سال جولائی میں کہا: "ہمارا ملک اب پہلے سے طاقت ور ضرور ہے مگر ابھی اتنا مضبوط نہیں ہوا جتنا ہم چاہتے ہیں۔ اگر ہم اسی شدومد سے بیس تیس سال کام کرتے چلے جائیں تو تب واقعی یہ اتنا طاقتور ہوجائیگا۔

یوآن: دو روپے (پاکستانی) تَل: تقریباً ایک چھٹانک، ژِن: تقریباً آدھ سیر
مو: تقریباً $\frac{1}{6}$ ایکڑ۔

ترجمہ: اخن اقون

پروفیسر محمد عثمان کی نئی اور عہد آفریں کتاب

اسلام پاکستان میں

- ★ عورت، سیاست، تعلیم، معیشت اور معاشرت کے بارے میں قرآنی تعلیم کی دیانتدارانہ وضاحت
- ★ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم کے افکار کا بے لاگ جائزہ
- ★ پاکستان میں اسلام کے مستقبل پر ایک حقیقت پسندانہ نظر
- ★ معاشی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی بحث کا بصیرت افروز تجزیہ
- ★ پاکستان اور اسلام کے بنیادی مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک ناگزیر کتاب

قیمت: ارزاں ایڈیشن : ۵٫۵۰ روپے

مکتبۂ جدید - ۴ - شارع فاطمہ جناح - لاہور

دلیل کا طمانچہ

اسلام کے اُن ٹھیکیداروں کے مُنہ پر

جو اسلام کے مقدّس نام پر

زمینداری اور جاگیرداری کا تحفظ اور سامراجی مقاصد کے فروغ کا سامان کر رہے ہیں

زمینداری، جاگیرداری اور اسلام

از : رحمت اللہ طارق

اس معرکۃ الآرا کتاب میں قرآن حکیم کی تعلیمات، نبی اکرمؐ کی سیرت، صحابہ کرامؓ کے وطیرے اور عظیم مسلمان مفکروں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام ایک انقلابی دین ہے جس نے امیر اور غریب میں مساوات قائم کی اور بلالِ حبشیؓ کو عثمان غنیؓ کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔

آج کی عوامی تحریک میں اس انقلاب آفریں کتاب کا مطالعہ
اسلام اور نظریۂ پاکستان کی رُوح کو سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے

- ○ **ایک کتاب** جسے مُلک کے تمام عوام دوست حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔
- ○ **ایک کتاب** جو مساوات کے لیے جد و جہد کرنے والے ہر سیاسی کارکن کے وردِ زباں ہونی چاہئے۔
- ○ **ایک کتاب** جو پاکستان میں اقبالؔ، قائد اعظم اور ذوالفقار علی بھٹو کی "اسلامی سوشلزم" کی تفسیر ہے۔

مجلد، سفید کاغذ، بڑا سائز
آفسٹ کی بے داغ طباعت
قیمت : آٹھ روپے

البیان
چوک انارکلی، لاہور

ہفت روزہ نصرت لاہور ــــــــــ رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۴۸۷
ـــــ صدر دفتر: چوک انارکلی، لاہور ـــــ فون : 66606 ـــــ
محمد حنیف رامے نے شیخ حامد محمود کے زیرِ اہتمام نوائے وقت پرنٹرز لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

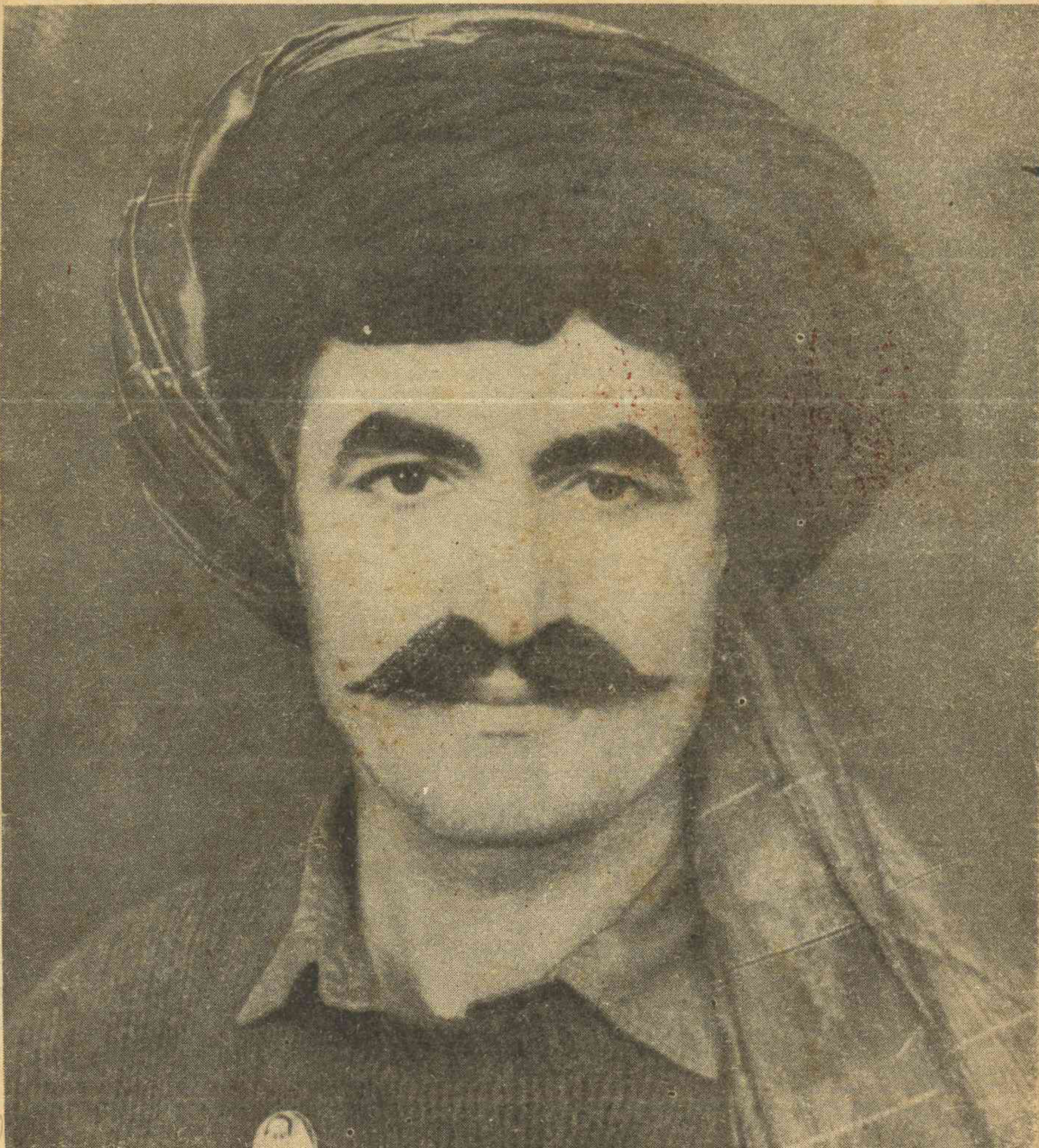عوامی جدوجہد میں پہلی قربانی دینے والا مجاہد — حق نواز خانؒ گنڈاپور — چیئرمین (ڈیرہ اسماعیل خانؒ) پیپلز پارٹی